سدا بہار کے پھول



سدا بہار کے پھول

اوم

سدابہار کے پھول

یعنی

دلچسپ، دلکش، دلآویز، دلنواز اخلاقی اور مجلسی کہانیوں کا نادر مجموعہ

مصنفہ

مہاشہ سدرشن جی جرنلسٹ لاہور

چھپے
نرائن دت سہگل اینڈ سنز پبلشرز و تاجران کتب بیرون لوہاری گیٹ لاہور

تیسری بار ایک ہزار قیمت ۱۲؍

فہرست

دیباچہ

لٹریچر میں ناٹک کا پایہ سب سے بلند ہے۔ اور اُس کے بعد ناول کا درجہ ہے۔ ناول ایک نصیحت یا سبق ہے۔ جس کے گرد بہت سے کیریکٹر گھومتے ہیں۔ اور کافی دیر تک گھومتے ہیں۔ وہ ڈھائی سو صفحے کی کتاب پڑھ چکنے کے بعد ناظرین کو ایک چیز دستیاب ہوتی ہے "نیکی اچھی ہے" "مظلوم کا انتظام قدرت لیتی ہے" "گناہ کا انجام تلخ ہے" "انجام کار فتح راستبازی کے قدموں میں آتی ہے" وغیرہ وغیرہ

لیکن ناول کے لئے وقت بہت صرف کرنا پڑتا ہے۔ موجودہ زمانہ مشغولیت کا زمانہ ہے۔ اسلئے آج کل مختصر قصوں، کہانیوں اور افسانوں کا رواج عام ہو رہا ہے۔ یہاں میں نے کہانی، قصہ اور افسانہ تین لفظ استعمال کئے ہیں۔ ممکن ہے بعض اصحاب ان تینوں الفاظ کے ایک ہی معنے لیتے ہوں۔ مگر میں ان تینوں الفاظ کے معنوں میں فرق سمجھتا ہوں۔

قصہ وہ واقعہ ہے جسمیں (Home life) کو دلآویز طریقہ سے بیان کیا جائے۔

کہانی۔ وہ قصہ ہے۔ جسمیں پیچیدہ واقعات رکھکر دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔

افسانہ۔ ایسی کہانی کو کہہ سکتے ہیں جس میں دئے ہوئے واقعات ایسے ہوں کہ عام زندگی میں نہ پائے جاتے ہوں۔

اس کتاب میں قصے کہانیاں اور افسانے تینوں شامل ہیں۔ میں نے انہیں لکھتے وقت اس بات کو خاص طور سے مدِ نظر رکھا ہے۔ کہ کوئی کہانی ایسی نہ ہو جس کا نتیجہ دل پر عمدہ اثر ڈالنے والا نہ ہو۔

بھارت۔ جالندھر اور چندر لاہور کی ایڈیٹری کے زمانہ میں چند کہانیوں کے لکھنے کا اتفاق ہؤا تھا۔ اسوقت ناظرین کے معقول حصّے نے اظہار پسندیدگی کر کے رائے دی تھی۔ کہ ایک کتاب کہانیوں کی تیار ہونی چاہیئے۔ اس کے بعد جُوں جُوں وقت گذرتا گیا۔ اور جُوں جُوں میں اور کہانیاں پبلک کے سامنے رکھتا گیا یہ تقاضے بڑھتے گئے۔ کہ کتاب جلد تیار کرو۔

کتاب تیار ہے۔ اور جیسی بھی ہے۔ نذر ناظرین کی جاتی ہے۔

ناول لکھنے کی نسبت کہانی لکھنا زیادہ دقّت طلب امر ہے۔ کیونکہ ناول میں اِدھر اُدھر نکلجانے کی کافی گنجائش ہوتی ہے۔ اور صفحے بہت ہوتے ہیں۔ کہانی میں یہ بات نہیں۔ اس میں تو قصّہ نویس کو ہر دم اندیشہ لگا رہتا ہے۔ کہ کہیں قصّہ طویل نہ ہو جائے۔ اس میں بہت جلد نتیجہ نکالنا پڑتا ہے۔ اور دریا کو کوزے میں بند کرنا پڑتا ہے۔

عمدہ قصّہ نویس کے لئے یہ ضروری ہے۔ کہ وہ تجربہ کار ہو۔ معمّر ہو۔ سیر و سیاحت کا شوقین ہو۔ اور اُس کے اردگرد کے حالات تبدیل ہوتے رہتے ہوں۔ اُس کا حافظہ کمزور نہ ہو۔ تاکہ وہ بھول نہ جائے۔ کہ میں پیچھے یہ بات لکھ آیا ہوں۔ اب اس کے خلاف لکھنا درست نہ ہوگا۔

مجھے پنجاب کا فسانہ نویس کہا جاتا ہے۔ مگر میں صاف تسلیم کرتا ہوں۔ کہ مجھ میں وہ ایک بات بھی نہیں ہے جسکا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ یہ کتاب اس غرض سے پیش کرتا ہوں کہ پنجاب میں بھی لائق فسانہ نویس پبلک کے سامنے آئیں۔ اپنے قلم کے جوہر دکھائیں۔ راگی کو اکسانا ہو تو اُس کے سامنے لوگ گنگناتے ہیں۔

ناظرین سے یہ درخواست ہے۔ کہ جہاں کہیں وہ کوئی فروگذاشت دیکھیں مصنف کو اطلاع دیدیں۔ تاکہ نئے ایڈیشن میں اُس کی اصلاح کی جا سکے۔

(سُدرشن)

اوم

سدا بہار کے پھول

نمک خوار

مسٹر شیام سُندر کلکتہ کے متمول تاجر تھے۔ بہت خوش وضع، بہت خوش شکل ہزاروں کا بیوپار تھا، کئی بنکوں میں حصے تھے۔ مکان تھے، دکانیں تھیں، کارخانے تھے، کوٹھیاں تھیں، روپیہ پانی کی مانند آتا تھا اور پانی کی مانند بہ جاتا تھا۔ شیام سندر رنگیلے آدمی تھے، خرچ کی پرواہ نہ تھی۔ اُن کے ہاں نت کوئی نہ کوئی دعوت رہتی، دسہرہ آیا، جلسہ ہونا چاہیئے، احباب دو گھڑی اکٹھے ہونگے۔ ذرا رونق ہی سہی۔ دیوالی آئی خوشی منانا چاہیئے، کون جانے سال کے بعد کیا ہونا ہے بساکھی پر دل کھول کر صرف کیا نئے سال کا نیا دن ہے۔ چار سو اُٹھ جائے گا تو کون قلعہ کو آگ لگ جائے گی!

مٹھاس پر مکھیاں بہت جمع ہو جاتی ہیں۔ شیام سُندر کے گرد دوستوں (۱) کا جمگھٹا رہنے لگا۔ اُن کو روپیہ کی ضرورت تھی اور ان کو پرواہ نہ تھی اکثر گرمی

سے فرمایا کرتے۔ روپیہ کیا ہے؟ ہاتھوں کی میل! اسے آدمی بناتا ہے۔ آدمی ہی گنوا دیتا ہے۔ جو گنوایا جاتا ہے۔ اُسے پیدا کرنا کچھ دشوار نہیں ہے۔ آدمی روپے کو بناتا ہے، روپیہ آدمی کو نہیں بنا سکتا۔ جو روپے کی پرواہ کرتے ہیں۔ اُن کے دماغ میں خلل ہے۔ روپیہ کی خوبی ہی اس میں ہے کہ صرف کیا جائے، ورنہ دبا رکھنے کو سونا۔ لوہا دونوں برابر ہیں۔ لکشمی دیوی قید سے گھبراتی ہے اور اُڑ کر وہاں پہونچتی ہے۔ جہاں آزادی کی ہوائیں آتی ہوں، اور ایک ہاتھ سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے میں جانے کا موقع ملے۔ اکثر کبیر صاحب کا یہ دوہا زبان پر رہتا ہے

دیہہ دھرے کا گن یہی دیہہ دیہہ کچھ دیہہ   اسُرن پھر پچھتاؤگے جب دیہہ ہو جاکے کھیہہ

گنگا بہ رہی ہو تو پرندوں کے پانی پینے سے کمی واقع نہیں ہو جاتی۔ آئی دولت ہے۔ کس دن کام آئے گی۔ جو قابل ہوتے ہوئے بھی یار دوستوں سے دریغ کرے اس کی زندگی پر لعنت ہے۔ احباب سُنتے تو پیٹھ ٹھونکتے، مرحبا آفریں کے نعرے بلند ہوتے "آپ فی الحقیقت اپنے وقت کے کرن ہیں"۔ شیام سُندر یہ سنتے تو پھُولے نہ سماتے۔ مسکراہٹ ہنسی کی صورت اختیار کر لیتی۔ مگر ضبط کرتے اور سر جھکا کر کہتے "یہ آپ کا حسن ظن ہے"۔

شیام سُندر کے خیالات زبان سے نہیں دل سے نکلتے تھے اور زبان سے زیادہ سرگرمی کا اظہار دست سخاوت سے ہو جاتا تھا۔ ایک دوست نے قد آدم آئینہ دیکھ کر تعریف کی۔ شام کو آئینہ اس کے ہاں پہونچا دیا گیا۔ ہارمونیم پونے دو سو کی خرید تھا۔ ایک دن ایک راگی نے بجایا تو در و دیوار وجد میں آگئے۔ شیام سُندر بہت محظوظ ہوئے اور انعام میں باجہ ہی راگی کو بخش دیا۔ گدیلے دار کرسیوں اور چارپائیوں کا سٹ تین سو ساٹھ کو منگوایا اور ہنسی ہنسی میں ہی گاموں پہلوان کے

ہاں بھجوا دیا گیا۔

ان دریادلیوں کے ساتھ ساتھ محفلیں بھی منعقد ہوتی رہیں، اوّل اوّل تو پیاس بیویوں سے ہی بجھ جاتی تھی، مگر آہستہ آہستہ نئے دوستوں کے ساتھ لال پری بھی چھلکتے ہوئے محفل میں داخل ہوئی۔ ابتداً تھی۔ ہوتے ہوتے نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ اس کے بغیر محفل کا رنگ ہی نہ جمتا اور مسٹر شیام سندر پر تو وہ جادو ہوا کہ چوبیس میں سے بیس گھنٹے غٹ رہنے لگے۔ ملازموں نے یہ دیکھا تو اپنا آپ بنانے کی فکر ہوئی۔ ایک سورج پھٹتا ہے تو کئی زمینیں بن جاتی ہیں۔ کیا ایک امیر کے بگڑنے سے بیسوں غریبوں کے دن نہ پھر جائیں گے۔ ملازم ان سوالوں کے عملی حل سوچ رہے تھے اور غریب پدما رو رو کر ایشور سے پرارتھنا کر رہی تھی کہ میرے خاوند کو سیدھا رستہ دکھا۔ مگر شیام سندر اپنے راہ پر سرپٹ دوڑ رہے تھے۔ نہ آنکھیں ملازموں کے بد ارادے دیکھ سکتی تھیں۔ نہ کان بیوی کی پرارتھنائیں سنتے تھے۔

(۲)

ایشور داس ان کا خاندانی ملازم تھا۔ بہت نیک اور انتہائی درجہ کا وفادار شیام سندر کے والد کہا کرتے تھے کہ ایسا نیک ملازم وستیاب ہو جانا اُن کے لئے ایک برکت ثابت ہوا ہے۔ ایک دفعہ اُس نے اُن کی جان بچائی تھی۔ اور اپنے آپ کو جوکھوں میں ڈالدیا تھا۔ جب وہ مرنے لگے تو شیام سندر کا ہاتھ اسی کے ہاتھ میں دے گئے تھے اور شیام سندر کو نصیحت کر گئے تھے کہ یہ تمہارے والد کی جگہ ہے جو عزت اب تک تمہارے دل میں میرے لئے تھی وہ اب ایشور داس کے لئے ہونی چاہئے۔ مرنے والے آقا اور باپ کے سامنے ایشور داس نے روتے ہوئے شیام سندر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور شیام سندر نے سر جھکا کر ایشور داس کی اطاعت کرنے کا عہد کیا۔

والد کے انتقال کے بعد شیام سُندر نے اپنے قول کو پُورا پُورا نبھانے کی سعی کی
در بار اور روپیہ پیسہ ایشور داس کے ہاتھ میں ہی سونپ دیا۔ نہ صرف یہ بلکہ گھر کے
پوشیدہ امور جنہیں شیام سُندر پدما سے بھی چھپا کر رکھا کرتے تھے۔ ایشور داس کے
سامنے بے دریغ کہ ڈالتے اور کوئی کام نہ کرتے جس میں ایشور داس سے مشورہ
نہ لیتے۔ ایشور داس نیک دل آدمی تھا۔ تجربہ کار۔ جہاندیدہ دُنیا کے سرد و گرم بہت
دیکھے تھے۔ اور نشیب و فراز سے کماحقہ واقفیت تھی۔ بال کی وہ کھال نکالتا۔ اور
بات کی اس تہ تک پہونچتا کہ شیام سُندر دیکھتے رہ جاتے اور کہتے کہ میں اگر گھنٹوں
مغز ماری کرتا تو بھی اس نتیجہ پر نہ پہنچ سکتا۔ ایشور داس ہنس پڑتا۔ "بات ٹھیک بھی
ہے آپ کے پاس علم ہے لیکن تا حال عمل کی صورت میں نہیں آیا۔ علم سونا ہے
مگر زمین کی مٹی اور آلائش سے لت پت۔ جب تک عمل کی بھٹی میں گرم نہ کیا جائے
چمک پیدا نہیں ہوتی۔ اور جب تک چمک نہ ہو۔ تب تک دُنیا کی منڈی میں کوئی
قدر نہیں، کوئی قیمت نہیں"
جب مسٹر شیام سُندر کی صحبت بگڑنے لگی اور رنگ ڈھنگ بدلنے لگے۔ تو قدرتاً
ایشور داس کو تردد ہوا۔ آدمی سمجھدار تھا۔ دُوبدو بات کرنا مناسب خیال نہ کیا
اشارے کنائے سے ایک دو دفعہ سمجھایا۔ لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ رنگ جو
چڑھ چکا تھا۔ اسقدر گاڑھا تھا۔ کہ سادے پانی سے نہ دھلا۔ اس کے لئے (ٹھوکر
کے) صابون کی ضرورت تھی۔
اِدھر کا تو یہ حال تھا۔ اُدھر پدما بھی اپنے فرائض سے لاپرواہ نہ تھی۔ عورت
کا زبردست ہتھیار رونا ہے جو اس نے استعمال کیا۔ کئی دفعہ رو رو کر اس نے
خاوند کو اس کی خطرناک روش سے آگاہ کیا اور خوفناک و المناک نتائج پیش کر کے
راہ بد ترک کرنے کی درخواست کی۔ شیام سُندر نے بارہا عہد کیا کہ آئندہ کو یہ غلطی مطلقاً

نہ ہوگی۔ لیکن جونہی زنان خانہ سے باہر قدم رکھتا تمام عہد فراموش ہو جاتے تمام اقرار پر پانی پھر جاتا۔ پھر وہی محفل آراستہ ہو جاتی۔ پھر وہی دور چلتے۔ عادت طبیعت ثانی ہو چکی تھی۔ بدلنا آسان کام نہ تھا۔

تیراک جب ہاتھ پاؤں مار مار کر تھک جاتا ہے۔ تب اسے سہارے کا خیال آتا ہے۔ ایشور داس اور پدما جب دونوں اپنی اپنی کوششوں میں ناکامیاب ہو چکے تب انہیں ایک دوسرے کے مشورے کی ضرورت لاحق ہوئی۔ ایک دن پدما نے منشی ایشور داس سے کہا۔ "کیا اب بالکل ہی کچھ نہ بنے گا؟" ایشور داس نے مہمل فقرے کا مطلب سمجھ کر جواب دیا۔ "بیٹی کچھ تم ہی بتاؤ۔ میری عقل کام نہیں کرتی پرماتما کے لئے کچھ سوچ کوئی معقول تدبیر نکالو۔ میرے کے کچھ نہ بنے گا۔ جو کچھ کرنا ہے آپ نے ہی کرنا ہے۔"

ایشور داس بہی پر جھک گیا۔ اور کچھ حساب لگا کر بولا۔ "نصف روپیہ ان عیاشیوں کی نذر ہو چکا ہے۔ کارخانے سب نقصان پر چل رہے ہیں کلرک بابو جی کے منہ لگے ہوئے ہیں۔ ان کو کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔ دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں۔ اگر یہی حال رہا۔ تو بہت جلد افلاس دروازے سے جھانک رہا ہوگا۔"

پدما کے آگے وہ نقشہ کھینچ گیا۔ جسے وہ بارہا خواب میں دیکھ چکی تھی۔ کہ اس کے بدن پر پھٹے پرانے چیتھڑے لٹک رہے ہیں اور ننھا ششی ایک ٹکڑہ روٹی کے لئے بلک رہا ہے! وہ سسکیاں لے لے کر رونے لگی اور کہنے لگی تم میرے باپ کی بجائے ہو۔ پرماتما کے لئے انہیں سمجھاؤ۔" ایشور داس آبدیدہ ہو کر بولا بیٹا سوتے کو جگانا آسان ہے۔ مگر جاگتے کو جگانا بڑا دشوار ہے۔"

جب یاس امید کے شیشہ کو توڑ دیتی ہے تو ایک ایک شیشہ سے یاس کی تصویر جھانکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ایشور داس کے جواب سے پدما کا شیشۂ دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ وہ بچوں کی مانند پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور بہت

یر تک روتی رہی۔ آخر یکایک کسی خیال کے ذہن میں آجانے سے پدما نے سر اُٹھایا
ور کہا "میں نے ایک بات سوچی ہے آپ مانیں گے؟"

ایشور داس نے بے صبری سے کہا "تمہاری رائے میں مجھے عذر نہ ہوگا"

پدما نے جواب دیا "مجھ پر جو آفت اور مصیبت آئے گی بخوشی کاٹ لوں گی۔ مگر معصوم ششی کی تعلیم و تربیت کا کچھ معقول انتظام ہونا چاہئے والدین کی غلطی کا خمیازہ بچوں کو کیوں بھگتنا پڑے؟"

ایشور داس سمجھ نہ سکا کہ پدما کا مطلب کیا ہے حیرت و استعجاب سے اس کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ اور بولا "بیٹی صاف صاف کہو"

پدما نے احتیاطاً چاروں طرف دیکھا۔ اور تب آہستہ سے بولی "آپ خزانچی ہیں سارا حساب آپکے پاس ہے ان کو کسی بات کا بھی پتہ نہیں"

"ٹھیک!"

"اگر تم چاہو تو آٹھ دس ہزار روپیہ اِدھر اُدھر کر لینا کوئی بڑی بات نہیں!"
ایماندار خزانچی کی پیشانی پر پسینہ آگیا اور وہ پدما کی تجویز کا اگلا حصہ سننے کو ہمہ تن گوش ہو گیا۔

"بس" پدما نے سلسلۂ تقریر کو شروع کرتے ہوئے کہا "ننھے ششی کی خاطر بے ایمانی کریں بے ایمانی کے کیا معنی۔ یہی روپیہ کی نصف مالک آپ کو اجازت دیتی ہوں کہ آپ دس ہزار روپیہ کسی ویرانے میں گاڑ آئیں۔ پرماتما نہ کرے۔ اگر ہم پر مصیبت کے دن ٹوٹ پڑے تو ششی آپکے سپرد ہوگا۔ ان افلاس کے ایام میں یہ روپیہ اس کی تعلیم و تربیت کے کام آئے گا!"

ایشور داس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور بولا "بیٹی تم نے میرے سینے سے بوجھ ہٹا لیا۔ میرا تمہارے ساتھ سولہ آنے اتفاق ہے"

پدما کا چہرہ چمک اُٹھا ہنس کر بولی "آج ہی یہ کام کر ڈالو تاکہ بے قرار دل کو قرار آ جائے"

ہمارے ہاتھوں کی نسبت زمین کی مٹی شیشی کے حق کی زیادہ حفاظت کر سکے گی"
ایشور داس نے سنجیدگی سے جواب دیا "بیٹی رات کو سب انتظام ہو جائے گا"

(۳)

دن گذر گیا۔ آفتاب چھپ گیا۔ رات آئی۔ ماہتاب طلوع ہوا۔ چاندنی کے خوف سے تاریکی درختوں کے نیچے چھپ رہی تھی اور جوں جوں چاندنی کم ہو رہی تھی تاریکی درختوں کے نیچے سے نکل نکل کر پھیل رہی تھی۔ ادھر یہ جنگ ہو رہی تھی۔ ادھر فرشتہ خصلت ایشور داس شیام سندر کے ساتھ نیکی کرنے کے لیئے شیام سندر کی چوری کر کے شہر سے باہر بھاگ رہا تھا۔ اور ویرانے کی تلاش میں تھا پونڈوں کی تھیلی کندھے پر تھی اور ہاتھ میں پکڑی ہوئی کدال زمین کی دیکھ بھال میں مصروف تھی۔ آخر ایک ویرانے میں محفوظ جگہ مل گئی۔ ایشور داس نے چاروں طرف دیکھا۔ اور کدال سے زمین کھودنے لگا۔ ایسا سخت کام کبھی پیشتر نہ کیا تھا۔ ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے مگر ایک خیال تھا جو اس کا حوصلہ بندھا رہا تھا اور ہاتھوں سے بزور کام لے رہا تھا۔ جب کافی گہری زمین کھودی جا چکی تو ایشور داس نے پونڈوں کی تھیلی رکھ کر مٹی ڈالنا شروع کیا اور جلد ہی زمین ہموار کر دی زمین ہموار کر کے جب وہ اپنے کام سے فارغ ہو چکا۔ اور واپس مڑنے کی تیا۔ یوں ہی تھا تو یکایک کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "منشی جی!

ایشور داس سر سے پاؤں تک لرز گیا اور اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی واپس مڑ کر دیکھا۔ تو شیام سندر سامنے کھڑے تھے۔ ایشور داس کا خون منجمد ہو گیا۔ اور وہ بت کی مانند کھڑا رہ گیا۔ شیام سندر بولے "منشی جی۔ یہ کیا معاملہ ہے میں اس وقت تک تمہیں فرشتہ سمجھے بیٹھا تھا۔ مگر آج آنکھوں سے پردہ ساہٹ گیا"
ایشور داس خاموش کھڑا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کسی نے اس کے لبوں پر مہر

لگادی ہے۔ شیام سُندر کدال اُٹھاکر زمین کھودنے لگے اور سوچنے لگے کُونیا میں کتنے بھیڑیئے ہیں جو بھیڑوں کے لباس میں پھر رہے ہیں۔"

ایشور داس سوچنے لگا۔ انسانی نگاہیں بسا اوقات دھوکہ کھا جاتی ہیں۔ اور سونے کو پیتل سمجھ کر پھینک دیتی ہیں۔ مگر جب حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔ تو آنکھیں کھلتی ہیں۔ شیام سُندر کا خیال تھا کہ تھیلی روپیوں کی ہے۔ مگر جب روپیوں کی جگہ پونڈ برآمد ہوئے تو غصّہ کی حد نہ رہی۔ اُن کے ہونٹ کانپنے لگے۔ اور آنکھوں سے آگ کے شعلے نکلنے لگے۔ وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولے "کیوں منشی جی! کیا اعتبار کرنے کا یہی نتیجہ ملنا چاہیئے تھا؟ معلوم ہوتا ہے تم نے مجھے بالکل اُجاڑ ڈالا ہے پتہ نہیں۔ ایسی کتنی تھیلیاں زیرِ زمین باہر کی ہوا کو ترس رہی ہیں۔"

یہ پہلا دِن تھا جب شیام سُندر نے ایشور داس کو آپ کی جگہ تم کہکر مخاطب کیا۔ اور ایسے ہتک آمیز الفاظ کہے۔ ایشور داس کو یہ امید نہ تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ شیام سُندر تفصیل پوچھینگے اور جو شک چشم دید چوری سے دل میں بیٹھ چکا ہے وہ پدما کے ایک ذرا سے سر جھکا دینے سے دُور ہو جائیگا۔ مگر اس کے خلاف شیام سندر لرزتی ہوئی آواز میں بولے "شیطان کے بچے۔ نمک حرام! بے ایمان! تیری بدمعاشیوں کا یہ ایک نمونہ ہے۔"

ایشور داس کی نگاہیں زمین پر گڑی ہوئی تھیں۔ وہیں گڑی رہیں۔ نہ نگاہ نے رحم کی التجا کی، نہ زبان سے معذرت کا کلمہ نکلا شیام سندر اور بھڑک اُٹھے۔ اور چھڑی سے ایشور داس کو مارنا شروع کر دیا۔ ایشور داس کے ساتھ کبھی ایسا سلوک نہ ہوا تھا۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگ پڑا۔ مگر شیام سندر پر غصّہ کا بھوت سوار تھا۔ اور وہ رنج و غم سے دیوانے بن رہے تھے۔ اس لئے بیدوں کی بوچھاڑ تب تک جاری رہی۔ جب تک بید کے پُرزے پُرزے نہ ہو گئے

ٹوٹا ہوا بید دیکھ کر شیام سندر نے پاؤں سے بُوٹ اُتار لیا۔ ایشور داس گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور سر جُھکا کر بولا "یہ سر حاضر ہے!"

جس طرح تیل سے آگ بھڑک اُٹھتی ہے۔ اسی طرح اس جواب سے شیام سندر کا غصہ بھڑک اُٹھا۔ اُنھوں نے ایشور داس کو گردن سے پکڑ لیا۔ اور زمین پر دے مارا۔ اُس کی چھاتی پر گھٹنا رکھ کر بیٹھ گئے۔ اور بُوٹ اُس کے مُنہ پر مارنے کو تھے۔ کہ بوٹ کسی نے پیچھے سے کھینچ لیا۔ شیام سندر نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ بوڑھا ہری داس کھڑا تھا۔ اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر کہہ رہا تھا "مہاراج غریب باھمن کی بات سُن لو۔ آپ معاملہ سے واکب ناہیں ہو۔ منشی صاحب پر جبر جستی ہو رہی ہے!"

شام سندر نے بات کاٹ کر کہا "تم کو جج کس نے بنایا ہے۔ تم یہاں کیوں آئے ہو۔ تم سے معاملہ کس نے پُوچھا ہے؟"

ہری داس نے جُھک کر کہا "حجور منسی ساب کھرے آدمی ہیں۔ یہ چوری ناہیں کرتے ہیں۔ آپ کا بھلا سوچتے ہیں، میری بات سُن لو۔ پھر جو جی چاہے کرنا۔ حجور مالک ہیں" شیام سندر بھیڑیئے کے مانند تند ہو رہے تھے۔ گرج کر بولے "حرامزادو چُپ ہو جاؤ!"

ہری داس اونچے خاندان کا برہمن تھا۔ کبھی اُس نے بہت عمدہ دن دیکھے تھے مگر گردش روزگار سے تنگ آ کر یہ نوکری کی تھی۔ تاہم نوکری میں بھی خاندانی وقار قائم رکھا تھا۔ دوسرے پنڈت جی کے سوائے کسی دوسرے لفظ سے کبھی کسی نے اُسے مخاطب نہ کیا تھا۔ گالی سُنکر خون جوش میں آ گیا۔ اور کہا "حجور جبان سنبھال کر بولیں!"

شام سندر نوکر کے مُنہ سے یہ الفاظ سُن کر گولہ ہی ہو گئے۔ چلا کر بولے "تو میرا نوکر ہے!"

ہری داس نے کہا "دیال سر بیچا ہے۔ بجت نا ہی بچی۔ کام کرتا ہوں۔ پیسہ لیتا ہوں۔ گالی دی تو خیر نہ ہوگی۔" شیام سُندر بھپرے ہوئے شیر کی مانند ہری داس پر ٹوٹ پڑے۔ اور "اُلو کا پٹھا" "سور کا بچہ" "نمک حرام" کہتے ہوئے اس کے ہاتھ سے بوٹ چھین کر اس کے سر پر لگانا چاہتے ہی تھے کہ ہری داس نے اُن کی ٹانگوں میں ہاتھ ڈال کر اُٹھایا اور زور سے زمین پر ٹپک دیا۔

ہری داس کسرتی جوان تھا۔ پھرتیلا جسم، پوری جوانی۔ شیام سندر کا بند بند دُکھنے لگا۔ غصہ سے ہونٹ بھینچے اور کانپتے ہوئے ہاتھوں نے جیب سے طمنچہ نکال کر سامنے کیا۔ ایشور داس اس وقت تک سنبھل چکا تھا۔ اُس نے طمنچہ دیکھا تو جان نکل گئی سمجھا کہ ہری داس کے سر پر قضا کھیل رہی ہے۔ دوڑ کر شیام سُندر کو پکڑنا چاہا۔ مگر اس تک پہنچنے نہ پایا تھا کہ ایک آواز سنّاٹے میں گونجی اور ہری داس زمین پر لوٹنے لگا۔

(۴)

چند منٹ تک شیام سُندر چپ چاپ کھڑے رہے۔ اور بھول گئے کہ میں نے ایک ہنستی بولتی ہستی کو موت کے گھاٹ اُتار دیا ہے مگر جب ہوش آیا۔ تو "غریب ہاتھن" کی لاش سامنے پھڑک رہی تھی۔ اور ایشور داس دانتوں میں اُنگلی دبائے کھڑا سوچ رہا تھا۔ کہ اب کیا کرنا چاہئے۔

شیام سُندر نے خیال کیا کہ یہ سب عالم خواب ہے۔ مگر پھر معلوم ہوا کہ نہیں جو کچھ ہے امر واقعہ ہے۔ میں ایشور داس سے لڑ رہا تھا، ہری داس نے دخل دینا چاہا۔ میں نے اُسے گالی دی وہ جوش میں آگیا۔ میں نے پھر گالی دی اُس نے اپنی حیثیت کا خیال نہ کرکے مجھے زمین پر ٹپک دیا۔ مجھے غصہ آگیا اور طمنچہ نکال کر اُس کی شاخ زندگی کو شجر حیات سے علیحدہ کر دیا۔ اُف اب کیا ہوگا۔ آہ۔ پھانسی ہوتی

تباہی۔ بربادی ہلاکت کے سوائے کوئی چارہ نہیں ہے۔ ایشور داس کے منہ سے پھول جھڑ رہے تھے۔ یہ امانت میں خیانت کرنے والے بے ایمان نوکر بول اب کیا ہو گا؟"

ایشور داس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا فوارہ پھوٹ پڑا۔ وہ زار زار روتے ہوئے بولا

"حضور۔ حضور! آپ یہاں سے چلے جائیں"

شیام سندر نے کہا "کہاں چلا جاؤں"

ایشور داس نے جواب دیا "آپ گھر چلے جائیں"

شیام سندر نے لاش کی طرف اشارہ کیا "اور یہ"

ایشور داس بولا۔ اس سے میں نپٹ لوں گا"

شیام سندر کے دماغ میں یکایک کوئی خیال آیا۔ انہوں نے طمنچہ وہیں پھینکا اور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ شہر کی طرف روانہ ہوئے

(۵)

دنیا سو رہی تھی مگر اس کے تمام مقام جاگتے تھے۔ صبح ہوئی تو یہ واقعہ بچہ بچہ کی زبان پر تھا۔ ہری داس مر چکا تھا۔ اور ایشور داس زیر حراست تھا۔ شیام سندر کی چشم دید شہادت تھی ایشور داس خود اقبال کر چکا تھا۔ پولیس انسپکٹر نے اپنے ہاتھ سے طمنچہ ایشور داس سے چھینا تھا۔ دو تین آدمیوں سے ایشور داس نے خود ہری داس کے خلاف بات چیت کی تھی اور اسے ہلاک کر ڈالنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ یہ شہادت معمولی نہ تھی۔ مقدمہ پیش ہوا گواہوں کے بیان لئے گئے۔ اس کے بعد جرم ثابت ہوا اور بے گناہ ایشور داس کو عبور دریائے شور کی سزا دی گئی۔ دنیا میں جھوٹے عزت و حرمت پاتے ہیں۔ اور انصاف اشرفیوں کے مول فروخت ہوتا ہے۔ چالاک آدمی دنیا کو مغالطہ دے سکتا ہے۔ مگر اپنے آپ کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ شیام سندر نے اپنی رسی ایشور داس کے گلے ڈلوائی تھی۔ جب اسے عبور دریائے شور کی سزا ہوئی تو دل پر چوٹ پہنچی اور آنکھ سے آنسو کا قطرہ بہ نکلا۔ ایشور داس نے استقلال سے سزا کا حکم سنا اور سنجیدہ شکل بنا کر شیام سندر

کی طرف دیکھا نگاہ سے نگاہ کا ملنا تھا کہ دونوں طرف سے آنسوؤں کے چشمے پھوٹ پڑے۔ ایک طرف
سے اس لئے کہ بے گناہ ہے مگر میری خاطر سزا اپنے سر لے رہا ہے۔ دوسری طرف سے اس لئے کہ پتہ
نہیں بیس سال زندگی ہے یا نہیں جو واپس آکر پھر اپنے آقا کی خدمت کر سکوں۔
ننگی تلواروں اور بھری ہوئی بندوقوں کے پہرے میں ایشور داس کو سپاہی عدالت سے
لے گئے اور شیام سندر روتے ہوئے گھر کو روانہ ہوئے۔ پدمنی نے سنا تو سر پیٹ لیا۔ اور کئی
دن تک متواتر غش آتے رہے۔

(۹)

شیام سندر کی حالت دن بدن خراب ہوتی گئی۔ شراب نوشی نے اُن کا دل و دماغ کمزور
کر دیا۔ اور وہ تباہی و بربادی کے گڑھے میں اُترتے گئے۔ بیس سال گذر گئے شیام سندر کوڑی
کوڑی کے محتاج ہو گئے۔ یار دوست دراصل روپے کے یار دوست تھے۔ جب روپیہ نہ رہا تو
وہ بھی کھسکنے لگے۔ جن کو شیام سندر کی دلجوئی کے سوا دُنیا میں کوئی کام ہی نہ تھا اب ان کو بھی
ضروری کام پیش آنے لگے۔ اور مصروفیتیں اس درجہ بڑھ گئیں کہ بازار سے گذرتے وقت دو باتیں
کرنے کو بھی وقت نہ رہا۔ ایک دو دوستوں کو تو اُن کے رشتہ داروں نے شیام سندر جیسے آوارہ
آدمی کے ساتھ ملنے سے منع بھی کر دیا۔
دولت کھو کر شیام سندر کو دولت کی قدر معلوم ہوئی۔ اور آنکھیں تب کھلیں۔ جب
بیچنے کو گھر میں کچھ بھی نہ رہا تھا —— گھر آہ گھر کس کا تھا۔ وہ بھی قرضخواہوں نے قرق کروا
لیا۔ اور اب وہ اپنی بدقسمتی کے دن وفادار بیوی اور نوجوان بیٹے کے ساتھ کاٹ رہا تھا چاندنی
مند چکی تھی۔ اور تاریک راتوں کا دور دورہ تھا۔ عہد طفلی کے پُر بہار ایام کی یاد نے بڑھاپے کے
دنوں کو اور بھی تلخ بنا دیا تھا پدمنی نے جو کیفیت عالم خواب میں بارہا دیکھی تھی۔ وہ سامنے موجود
تھی۔ وہ چاہتی تھی۔ آہ کسقدر چاہتی تھی کہ یہ بھی خواب ہو۔ مگر یہ خواب نہ تھا۔ بیداری تھی اور اگر
خواب تھا بھی تو وہ خواب جسکی بیداری نہ تھی۔ وہ نیند جس کا کوئی اختتام نہ تھا۔

وُہ جنہیں پھولوں سے خلش ہوتی تھی کانٹوں میں لوٹنے لگے اور جنہوں نے زمین پر کبھی پاؤں نہ رکھا تھا۔ اُنہیں زمین کا ہی سہارا ڈھونڈھنا پڑا۔ شیام سُندر ایک سیٹھ کی دُوکان پر کلرک مقرر ہو چکے تھے۔ صبح سے شام تک کام کرنے کے بعد بیس روپے ماہانہ آتے تھے اور دال روٹی میں ہی اُٹھ جاتے تھے۔ ششی کی تعلیم کا کوئی انتظام نہ تھا۔

غریب کلرکوں کے لئے مہینے کے آخری ایام بڑے تنگ ہُوا کرتے ہیں۔ شیام سندر کے ہاں بھی پچھلے دو تین دن چولھا گرم نہ ہُوا کرتا تھا۔

تیس تاریخ تھی۔ رات کا وقت اور شیام سُندر، پدما اور ششی سب کے سب بھوکے پیٹ بیٹھے ہوئے بدبختی کے زمانے کا ذکر کر رہے تھے اور ایامِ گذشتہ کو یاد کر کے آنسو بہا رہے تھے۔ مٹی کے چراغ کا تیل ختم ہو چکا تھا۔ اور اس کی لو بلند بلند ہو ہو کر مدھم پڑ رہی تھی۔ کہ باہر سے آواز آئی "ایشور کے لئے کوئی ایک روٹی دیدے!"

پدما نے کہا "بابا یہاں صبح سے کھیل اڑ کر حلق میں نہیں پہنچی۔ قسم ہے جو پانی کا گھونٹ بھی پیا ہو۔ ہوتا تو دریغ نہ تھا۔ لیکن اب کیا کیا جائے۔ مجبوری اور معذوری ہے!"

ششی جوش سے بولا "کچھ ہے تو دیجاؤ!"

بڈھے نے کھانستے ہوئے کہا "بیٹا! چار روٹیاں کہیں سے مانگ کر لایا تھا۔ یہ تم لے لو!" پدما غور سے سُننے لگی۔ شیام سُندر چلاّ اُٹھے "پدما! پہچانا؟ یہ ہمارا منشی ایشور داس ہے" لاٹھی ٹیکتا ہُوا اندر آ گیا۔ نقاہت بڑھ گئی تھی۔ کمر جھک گئی تھی۔ ہاتھوں میں رعشہ تھا۔ ٹانگوں میں کمزوری تھی۔ بال سفید ہو چکے تھے۔ شکل تبدیل ہو چکی تھی۔ لیکن چہرے پر وہی رونق وہی استقلال تھا۔ جو عدالت میں عبور دریائے شور کی سزا کا حکم سُنتے وقت تھا۔ شیام سُندر بے اختیار پاؤں پر گر پڑے۔ ایشور داس بیٹھ گیا۔ اور اُن کے سر کو چھاتی سے لگا کر بچوں کی مانند رونے لگا۔ اُسے روتا دیکھ کر شیام سُندر بھی رونے لگے۔ پدما بھی رونے لگی۔ ششی بھی رونے لگا۔ در و دیوار بھی رونے لگے۔

جب رو کر دلوں کا غبار نکل چکا۔ تو پدما نے کہا "منشی جی آپ کی کیا خاطر کروں۔ کہنا چاہتی ہوں کہ اب ہم مفلس ہیں۔ مگر شرم زبان روکتی ہے!"

ایشور داس نے جواب دیا "میں مفلس ہوں۔ تمہارے دشمن تم کیوں مفلس ہونے لگیں۔ ہیرے سے تم ابھی تک وہیں پڑا ہو"

پدما نے سر جھکا کر کہا "ہاں۔ کہنے کو بیشک وہیں ہوں۔ کیونکہ سن ہی چکے ہو صبح سے سب آدمی بھوکے ہیں۔"

ایشور داس کھڑا ہو گیا اور بغل سے تھیلی نکال کر شیام سندر کے آگے رکھ دی "یہ آپ کی امانت ہے۔ وہی تھیلی جس پر ہیرداس کا خون ہو گیا تھا۔ جب آپ یہاں سے شہر کو آگئے تھے تو مصلحتاً میں نے اسے ذرا فاصلے پر دبا چھوڑا تھا۔ اتنا عرصہ کلمہ پانی رہا۔ وہاں بھی اس روپے کا خیال نہ بھولتا تھا۔ شکر ہے آج میں نے آپکی امانت آپکے حوالے کر دی"

شیام سندر پدما شیتی سب کی آنکھوں سے شکر گذاری کے آنسو بہہ رہے تھے

بڈھا ایشور داس پھر بولا "شیام سندر تمہیں میں اب بتلاتا ہوں کہ میں یہ روپیہ چرا کر کیوں لے گیا تھا!"

شیام سندر بولے "بیکس دل فرشتے! مجھے شرمندہ نہ کریں وہ سب کچھ سن چکا ہوں آہ! اب مجھے شرم آرہی ہے کہ میں نے آپ کو سخت سست کیوں کہا۔ میں نے آپ کو سزا کیوں دلوائی۔ کاش میں پھانسی چڑھا دیا جاتا۔ میں بندوق سے اڑا دیا جاتا۔ مگر آپ کے معصوم جسم کو ایذا نہ پہنچی۔ آہ! میرے جیسا پاپی زمین پر سانس لینے کا حقدار نہیں ہے"۔

یہ کہکر شیام سندر رونے لگے۔

ایشور داس نے شیام سندر کو چپ کرایا اور کہا جو کچھ ہونا تھا ہو گیا اب یہ دس ہزار روپیہ ہے۔ اس سے کوئی بیوپار شروع کرو۔ اور مفید با امن شہریوں کے مانند زندگی بسر کرو۔ بہت ٹھوکریں کھا چکے ہو۔ اب غلطی نہ کرو گے"

پدما اور شیام سُندر دونوں ایشور داس کے قدموں میں جُھک گئے۔ اور کہنے لگے "تمہارا احسان عمر بھر نہ بھُولے گا۔ تم نے دُو بتوں کو بچا لیا ہے"
ایشور داس نے کہا آپ مجھے شرمندہ کرتے ہیں میں نے جو کچھ کیا ہے۔ اپنا فرض سمجھ کر کیا ہے
پدما بولی "آپ تو فرشتہ ہیں"
ایشور داس نے سر جھکا کر جواب دیا "آپ جو جی میں آئے کہیں مگر میں تو آپ کا وہی نمک خوار خادم ہوں"



اِنتقام

لال مرچ کیسی خوبصورت چیز ہے۔ مگر اِدھر زبان پر رکھا۔ اُدھر بچھو نے کاٹ کھایا۔ اِنسانوں
میں بھی ایسی لال مرچیں بہت سی ہیں۔ جو دیکھنے میں دلکش دلچسپ دلپسند۔ دلآویز۔ دلفریب ہیں
مگر جونہی نزدیک ہوئے۔ ہاتھ سے ہاتھ ملا۔ خوبصورت پھول تو نظر سے اوجھل ہو گیا۔ کانٹا ہاتھ
میں لگا۔ اور دِل و جگر کو چیرتا ہوا کلیجے میں جا لگا۔ دانا آدمی پھول سے پہلے کانٹے کو دیکھتے ہیں
جو ہری پتیوں کے نیچے پوشیدہ رہتا ہے۔ اور پھول پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے ہی ہاتھ کو لہولہان
کر دیتا ہے رام سنگھ بھی اِسی طرح کی لال مرچ تھا۔ دیکھنے میں خوش وضع۔ خوش شکل۔ خوش باش
مگر دل کا سیاہ۔ وہ جتنا خوبصورت تھا۔ اُتنا ہی بدسیرت بھی تھا۔ بگلے کی طرح اُس کا جسم
سفید تھا۔ مگر جسم کے اندر دھڑکنے والا دل توے کی طرح کالا تھا۔ اُس میں چھل تھا۔ کپٹ تھا
اور فریب و ریاکاری تھی۔ اُس کی باتیں کیا تھیں باقاعدہ ایک جال تھا۔ جو معصوم و بھولے بھالے
آدمیوں کو جکڑتا تھا۔ اور مچھلی کی طرح بیتاب و بے چین کر ڈالتا تھا۔ اُس کے قلم میں زور تھا
اور زبان میں زور تھا۔ لکھتا تھا۔ اور جادو کر دیتا تھا۔ بولتا تھا۔ اور در و دیوار وجد میں آ جاتے تھے
اُس کے ہم جماعت لڑکے اُس کی تقریر سُن کر کہا کرتے تھے کہ تیری زبان پر سرسوتی کا باس ہے
وہ امیر کا لاڈلا بیٹا تھا۔ خوبصورت تھا۔ اور بی اے کلاس کا طالب علم تھا۔ نہ کھانے کا فکر نہ
پینے کا اندیشہ۔ دن رات بناؤ سنگار میں رہنے لگا۔ اور خوبصورتی خوبصورتی کو ڈھونڈھنے لگی
پروفیسر موتی لال کے ہاں آنا جانا تھا۔ اُس کی جوان بیٹی للِتا نے رام سنگھ کو دیکھا۔ رام سنگھ نے اُسے
دیکھا۔ سمٹی ہوئی نگاہوں نے حیا پرور نگاہوں کو محبت کا سندیسہ دیا۔ جن میں خلوص کا رنگ پوشیدہ
تھا۔ اور وفا کی جھلک تھی۔ ایمانداری اور ضبط کے بند تو ڈھیلے تھے ہی۔ بدنامی اور خوف کی سنگین
دیواریں بھی کانپ کر گر گئیں۔ پروفیسر موتی لال کی غیر حاضری میں بھی رام سنگھ آنے جانے لگا۔ یہ بات ایسی

نہ تھی۔ جو چھپائے چھپتی۔ گلی سے محلے میں اور محلے سے بازار میں اُڑنے لگی۔ منہ بات۔ زبان پر یہی چرچا تھا۔ اور مکان مکان میں یہی ذکر تھا۔ مگر موتی لال کو اس کا کچھ پتہ نہ تھا۔ چراغ تلے اندھیرے والی کہاوت اُسپر صادق اُترتی تھی۔

(۲)

لیمپ جل رہا تھا۔ اور پروفیسر موتی لال میز کے آگے بیٹھا ہوا بڑی تشویش سے ایک چٹھی پڑھ رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا۔ کہ ایک ایک لفظ اُسکے جگر پر برچھیاں رکھ رہا ہے چٹھی ختم ہوئی۔ پروفیسر موتی لال نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور اضطراب آنسوؤں کی شکل میں آنکھوں سے باہر نکلا۔ ایک دفعہ پھر چٹھی اُٹھائی اور پڑھنے لگا۔

تاریکی کے باسی!

کچھ گھر کی بھی خبر ہے۔ لوگ رات کو سوتے ہیں اور سوتے میں بھی بیدار رہتے ہیں۔ تم دن کو بھی سوتے ہی رہتے ہو۔ اور جاگتے ہوئے بھی آنکھیں نہیں کھولتے۔ بازار میں جاؤ محلے میں جاؤ شہر میں جاؤ باہر جاؤ۔ تمہاری بدنامی کی ٹٹی سب طرف آسمان کو جارہی ہے۔ مگر تم ہو کہ اس دُنیا میں ہی نہیں رہتے رام سنگھ تمہاری غیر حاضری میں گھر آتا ہے اور تمہاری کنواری جوان بچی مسکراہٹ آمیز نگاہوں سے اُس کا استقبال کرتی ہے۔ اس میں بھی کچھ بھید ہے۔ اگر اب بھی نہ سمجھو۔ تو پھر کسی کا کیا قصور۔ تم تاریکی میں تھے۔ اطلاع دینا فرض تھا۔ سو پُورا کر دیا۔ جو مناسب سمجھو وہ کرو۔

راقم ایک دوست

دوبارہ چٹھی پڑھ کر موتی لال کا چہرہ لال ہو گیا۔ اور آنکھوں سے آگ کے شعلے نکلنے لگے نوکر نے کہا۔ اور للتا نے سُنا کہ آج بابو جی کی طبیعت خراب ہے۔ روٹی کھانے کو جی نہیں چاہتا۔ للتا کو باپ سے انتہائی درجے کی محبت تھی۔ دوڑتی ہوئی آئی۔ اور پیار سے باپ کی طرف دیکھ کر کہا۔ "آج کیا ہے؟

موتی لال بولا "پیٹ میں کچھ گڑبڑ ہے۔ طبیعت بگڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے"۔
للتا نے پوچھا "پھر؟"
موتی لال نے جواب دیا "فکر کی بات نہیں۔ تم آرام کرو میں فاقہ کرکے ٹھیک ہو جاؤں گا"۔
للتا حیران تھی۔ کہ بات کیا ہے کہ پتا باپ خفگی سے جواب دے رہا ہے۔ مگر پھر کچھ سوچ
چپ ہو رہی۔
دوسرے دن موتی لال نے کالج میں رام سنگھ پر نظر رکھی۔ بائبل کا گھنٹہ آیا ساتھ لگا
ٹ خالی تھا۔ اور اس سے اگلا آدھی چھٹی کا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ رام سنگھ کا پتہ نہ تھا ایک
ب علم سے معلوم ہوا۔ کہ شہر کی طرف گیا ہے۔ غصہ ضبط نہ ہوا۔ پروفیسر موتی لال نے بائیسکل
ائی۔ اور گھر کی طرف روانہ ہوا۔

(۳)

جسطرح کوئی میٹھا سا خواب دیکھنے والا آدمی جگانیوالے پر ناراض ہو جاتا ہے اسیطرح
سنگھ نے جب للتا کے ساتھ راز و نیاز کی باتیں کرتے ہوئے دروازے کا کھٹکا سنا تو کر
سا معلوم ہوا۔ للتا نے گھبرا کر دیکھا۔ موتی لال سامنے کھڑا تھا۔ رام سنگھ شرم سے پانی
نی ہو گیا۔ اور للتا کی نگاہیں باپ کے قدموں پر گر کر معافی کی خواستگار ہوئیں
ی لال نے کہا۔ "رام سنگھ! تم میرے ساتھ بیٹھک میں آؤ"۔
رام سنگھ نے چپ چاپ تعمیل کی للتا نے ٹھنڈی سانس بھری۔ کرسی پر بیٹھ کر اور رام سنگھ
بیٹھنے کا اشارہ کرکے موتی لال نے کہا۔ جو کچھ ہو گیا سو ہو گیا۔ اب آئندہ کیا ہو گا؟"
رام سنگھ نے نیچے دیکھتے ہوئے جواب دیا "جیسا آپ کہیں"۔
موتی لال نے پوچھا "تمہیں للتا سے محبت ہے؟"
رام سنگھ نے کچھ جواب نہ دیا
موتی لال نے کہا "شرم کی کوئی بات نہیں صاف کہو"۔

رام سنگھ نے آہستہ سے جواب دیا "ہاں!"

موتی لال نے پوچھا "اُسے تم سے محبت ہے"

رام سنگھ نے کہا "ہاں"

موتی لال نے کہا "پھر تم اس سے شادی کر لو۔ یہ سب سے اچھی بات ہے۔ کیوں ہے نا؟"

رام سنگھ نے حیرانی سے موتی لال کی طرف دیکھ کر کہا "ہاں!"

موتی لال نے پوچھا "اُسے تم سے محبت ہے؟"

رام سنگھ نے کہا "ہاں"

موتی لال نے کہا "پھر تم اس سے شادی کر لو۔ یہ سب سے اچھی بات ہے۔ کیوں ہے نا؟"

رام سنگھ نے نیچے سر کر کے کہا "واقعی غلطی ہوئی"

موتی لال بولا "خیر اچھا ہوا۔ اب آئندہ بدنامی نہ ہوگی" یہ کہا اور رام سنگھ کو گلے سے لگا لیا۔ بیٹا گرنا کوئی شرم کی بات نہیں۔ گر گر کے رہنا پاپ ہے۔ میرے اصول سن کر لوگ مجھے بے غیرت کہہ دیتے ہیں۔ مگر میں پرواہ نہیں کرتا۔"

(۴)

اس واقعہ کو چھ ماہ گذر چکے ہیں۔ اب پروفیسر موتی لال وہ موتی لال نہیں۔ جو پہلے تھا! وہ ہر وقت اداس گھڑی غمگین اور ہر لحظہ بے چین و بے تاب رہتا ہے۔ رام سنگھ کی حریص نگاہوں نے اپنے لئے نئی زمین اور نیا آسمان پسند کر لیا۔ امیر طبیعت کا لڑکا ایک غریب پروفیسر کی لڑکی کو بیاہ لے۔ یہ وہ گوارا نہ کر سکا۔ عیاشی پسند طبائع محبت سے قطعی ناآشنا ہوتی ہیں انہیں ہر دم نئے کھلونے کی آرزو رہتی ہے۔ اور اس کے بعد وہ دوسری چیز کی تلاش کر لیتی ہیں۔ رام سنگھ نے محبت کے تار کو ڈھیلا کر دیا۔ نہیں توڑ دیا۔ اب وہ اُن کے چوبیس گھنٹے اور ہفتے کے سات دن نیپا کے تصور میں مست رہنے لگا۔ للتا نے یہ سنا اور خاموش رہ گئی مگر انتقام لینے کا خیال دل میں چٹکیاں لینے لگا۔

پروفیسر موتی لال اپنی لڑکی کی روز بروز ردی ہونیوالی حالت کو دیکھتا تھا۔ اور دل ہی

دل میں کڑہتا تھا۔ اُس کا جو کچھ تھا۔ للتا کے لئے تھا عورت مرچکی تھی بیٹے گذر چکے تھے۔ مایوس اور ٹوٹا ہؤا دل للتا کے چہرے پر اُمید کو تلاش کرتا تھا۔ اور جب وہاں بھی مایوسی اور ناامیدی کا رنگ جھلکتا ہؤا دیکھتا تھا۔ تو اُس کے جگر میں بھالے چبھ جاتے تھے اور دل میں تڑپ سی پیدا ہو جاتی تھی اُسے رام سنگھ پر بے اختیار غصّہ آتا تھا۔ مگر کچھ نہ کر سکتا تھا۔ وہ وقتاً فوقتاً جماعت میں اُسکی بےعزتی بھی کر دیا کرتا تھا حد سے زیادہ سختی کا پابند پروفیسر اُسے کچھ نہ کہتا تھا۔ اسپر لڑکے بڑے حیران تھے۔

(۵)

کانپتے ہوئے ہاتھوں سے رام سنگھ بی اے نے تار کھولا پڑھا۔ اور چہرے کا رنگ اُڑ گیا اُس کے ہاتھ کانپے۔ اُسکے پاؤں کانپے۔ اُس کا سر کانپا۔ اُسکا سارا جسم کانپا۔ اور وہ گرنے کو تھا کہ اُس کے دوست ترلوچن داس نے آکر اُسے سنبھال لیا۔ تکلیف زدہ انسان جب ہمدردی کی آواز سنتا ہے تو آنسوؤں کا فوارہ پھوٹ کر نکل پڑتا ہے۔ ترلوچن داس کا منہ دیکھتے ہی رام سنگھ بلک بلک کر رونے لگا۔ اور ہچکیوں سے دم رُک گیا۔ ترلوچن داس نے پڑھا۔ اور ٹھنڈی سانس بھر کر بولا "رام سنگھ واقعی تمپر آسمان ٹوٹ پڑا۔ مگر ابھی امید کی جھلک باقی ہے۔ رام سنگھ نے کہا۔ اُس کا بچنا اب مشکل سے۔ میرا دل بیٹھا جاتا ہے اور آواز آتی ہے کہ کام ہوگیا"

ترلوچن داس نے کہا۔ "تم فوراً گھر پہنچو۔ علاج کرو۔ اور وہ بچ سکتی ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ مرجائے" جلدی جلدی سے اسباب باندھ کر رام سنگھ نے اسٹیشن کا راستہ لیا۔ اور ترلوچن داس کو کہا۔ کہ میری طرف سے عرضی داخل کر چھوڑنا ہفتے تک لوٹ آؤں گا"

لاہور پہنچکر دیکھا۔ تو چمپا بیہوش تھی۔ وفور محبت میں شرم اور بیماری کے خوف کو بالائے طاق رکھ کر رام سنگھ اپنی بیوی سے لپٹ گیا۔ چمپا نے آنکھیں کھولیں۔ اسے دیکھ کر کہا۔ آپ آگئے۔ مجھ سے پرے رہو۔ کہیں آپ کو کچھ نہ ہوجائے۔ مگر رام سنگھ نے اُسے اور بھی زور سے گلے لگالیا۔ اور اُس کے نیلے ہونٹوں سے ہونٹ ملا دیئے۔

علاج شروع تھا ہی اب اور بھی غور و پرداخت سے ہونے لگا۔ رام سنگھ کے باپ نے رام سنگھ

کو سمجھایا۔ کہ تم بچکر رہو۔ بیماری بڑی خوفناک ہے۔ مگر اُس نے سُنا ان سُنا برابر کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوُا کہ نہ ہی تو چھپا جا سکی اور نہ ہی رام سنگھ بیماری سے بچا۔ اُسے بھی پلیگ ہو گئی۔

(۶)

زمین چمن کیا کیا گل کھلاتی ہے۔ اور آسمان کیا کیا رنگ بدلتا ہے۔ ابھی صبح ہے ابھی شام ہو گئی۔ جہاں نقارے بجتے تھے۔ وہاں ماتم کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ رام سنگھ سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوُا تھا۔ اور اُس نے کبھی تکلیف کا مُنہ نہ دیکھا تھا۔ بیماری سے لاچار پڑا تھا۔ کہ ماں باپ کو بھی اسی نامراد بیماری نے دبا لیا۔ رام سنگھ ابھی بیمار ہی تھا۔ کہ ماں اور باپ دونوں چل بسے۔ نوکر چاکر پہلے ہی رفو چکر ہو رہے تھے۔ اب سارے مکان میں کوئی اُس کے حلق میں پانی ٹپکانے والا بھی نہ تھا۔ وہ ہوش میں آ کر کراہتا تھا۔ اور تڑپتا تھا۔ زور سے اتنے زور سے چلنے سے کہ اُسکا حلق اجازت دے سکتا تھا۔ وہ چلا چلا کر پانی کے لئے التجا کرتا کبھی کبھی کوئی پڑوسی آ کر اُسے پانی کا پیالہ دے جاتا۔ اور بھاگ کر باہر نکلجاتا۔ جلتی آگ سے دُور رہنا ہی اچھا۔

ایسے مواقع پر چور اچکوں کی چاندی ہوُا کرتی ہے۔ اور بدمعاشوں کو سنہری موقعہ ملتا ہے۔ کہ دل کی مرادیں پوری کریں۔ اور گوہر مقصود سے ہاتھ گرم کریں۔

میدان صاف دیکھ کر ایک رات کو مکان میں چور داخل ہوُئے اور سب کچھ لوٹ لاٹ کر چلتے بنے۔ جو کل ہزاروں کا مالک تھا۔ آج کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گیا۔

(۷)

چلچلاتی ہوئی گرمی میں ایک عورت رام سنگھ کے کمرے میں داخل ہوئی ۔ اُس کے ساتھ ایک ڈاکٹر تھا۔ عورت کے منہ پر ایک نقاب تھا۔ اور وہ بے چینی و بے تابی سے ڈاکٹر کی رائے کا انتظار کر رہی تھی۔ رام سنگھ بیہوش تھا۔ ڈاکٹر نے معائنہ کر کے کہا "یہ بچ سکتے ہیں"

عورت نے جواب دیا "پھر آپ اچھی طرح سے علاج کریں۔ میں آپ کو خوش کر دوں گی۔ اس کا آپ خیال نہ کریں"

ڈاکٹر نے کہا۔ شریف لڑکی۔ تم فکر نہ کرو۔ روپیوں کا خیال مجھے اسوقت ہوگا۔ جب یہ بستر سے اٹھ کھڑے ہونگے۔"

اسدن سے عورت نے خون پسینہ اور رات دن ایک کر کے رام سنگھ کی خدمت کرنا شروع کیا رام سنگھ پر متواتر بیہوشیاں طاری رہنے لگیں اور عورت نے سات دن رات تک آنکھ نہ جھپکی سرہانے بیٹھی رہی اور اوقات معینہ پر دوائی پلاتی رہی۔

ساتویں دن ڈاکٹر نے کہا "اب یہ خطرہ سے باہر ہیں۔ یہ دوائی لو۔ دن میں تین دفعہ پلانا ہے۔ اب ان کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

نقاب والی عورت نے ہاتھ سے سونے کے کڑے اُتارے اور ڈاکٹر کی خدمت میں رکھدیئے ڈاکٹر نے نہ نہ کیا۔ مگر سونے کو چھوڑنا ذرا مشکل سی بات ہے لے لئے اور چلدیئے۔

ڈاکٹر کے جانے پر رام سنگھ نے کہا "کیا میں جان سکتا ہوں کہ میری محسن کا نام کیا ہے؟"

نقاب والی عورت نے جواب دیا "میرا نام للتا ہے"

جو حالت بجلی گرنے سے انسان کی ہوتی ہے وہی حالت رام سنگھ کی یہ حال سنکر ہوئی اُس نے پوچھا "آپ کے پتا کا نام ہ"

للتا نے جواب دیا "میں لالہ موتی لال پروفیسر کی بیٹی ہوں اب آپ جان گئے میں کون ہوں جسدن آپ نے مجھے غریب جان کر اپنے قدموں میں لینے سے انکار کر دیا۔ اُسی دن میں نے آپ سے انتقام لینے کی پرتگیا کی تھی۔ اب میری پرتگیا پوری ہوگئی ہے۔ اس سے زیادہ سخت انتقام میں نہیں لے سکتی تھی۔"

رام سنگھ نے کہا "للتا مجھے معاف کرو۔ آئندہ میں تمہارا اسیوک رہوں گا۔"

"للتا نے جواب دیا" کانٹوں میں کیوں گھسیٹتے ہیں۔ میں تو ایک غریب پروفیسر کی لڑکی ہوں۔"

یہ کہکر للتا باہر نکل گئی۔ رام سنگھ نے اُسے تلاش کیا مگر وہ نہ ملی۔ اُس کا باپ بھی اسی غم میں کڑھ کڑھ کر مرگیا۔ اس کا کوئی پتہ نہ ملا۔

(۷)

"دروازہ کھولو۔ دروازہ کھولو"

پچھلے پہر کا وقت تھا۔ ترلوچن داس دیر سے سویا تھا۔ اس لئے نیند کا خمار اُس کی آنکھوں میں ابھی باقی ہی تھا۔ کہ دروازہ کھولو۔ دروازہ کھولو کی آواز سُن کر بڑبڑاتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔ باہر آیا رام سنگھ سامنے کھڑا تھا۔ اُس کے چہرے کا رنگ کپاس کے پھولوں کی طرح پیلا تھا۔ اور آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے باہر کو جھانک رہے تھے۔ ترلوچن داس نے پیار سے اُس کو اندر لاکر چارپائی پر بٹھا دیا۔ اور کہا۔ "کہئے کیا حال ہے؟"

رام سنگھ نے جواب دیا "کیا پوچھتے ہو۔ سخت اضطراب میں ہوں۔ رات کی بات کہتا ہوں للتا کی تصویر دیکھتا دیکھتا سو گیا۔ خواب میں دیکھا کہ گنگا کے کنارے پھولوں کی کٹیا ہے جس میں شانتی کا دور دورہ ہے۔ اور امن و مسرت کی ہوائیں آتی ہیں۔ گنگا کے پانی میں شادمانی کی ترنگیں (لہریں) اُٹھتی ہیں۔ اور دیکھنے والوں کو ایسی سرزمین میں پہنچا دیتی ہیں۔ جہاں عشق لیتا ہے اور پریم کی حکومت ہے۔ جہاں انسان نہیں انسان کا خیال ہی پہنچ سکتا ہے۔ ایسی جگہ میں ایک عورت زار زار روتی تھی۔ اور تڑپتی تھی۔ میں نے حیرت زدہ ہو کر اپنے دل سے سوال کیا کہ کیا ایسے سہانے منظر میں بھی رونے۔ کراہنے اور تڑپنے کی گنجایش نکل سکتی ہے۔ اُسی وقت میں نے دیکھا۔ کہ عورت نے اپنی چھاتی سے ایک کاغذ کا ٹکڑا نکالا۔ اور اُسے آنکھوں سے لگا کر چومنے لگی۔ میں نے کوشش کی۔ آگے بڑھا۔ اور یہ دیکھ کر میں گھبرا گیا۔ کہ اُس کے ہاتھ میں میرا فوٹو ہے۔ میں نے عورت کا نقاب اُلٹ دیا۔ اور یہ دیکھ کر میرے تعجب و خوشی کی انتہا نہ رہی۔ کہ میری تصویر کو چھاتی سے لگا کر رکھنے والی اور میری یاد میں رونے اور تڑپنے والی عورت للتا کے سوائے کوئی دوسری نہ تھی۔

"للتا نے مجھے دیکھا۔ وہ بے اختیار مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے اُسے زور سے گلے لگا لیا۔ اور اُس کا منہ چوم چوم کر آنسوؤں سے اُس کے منہ کو بھگونے لگا۔ یہ آنسو رنج کے نہیں۔ خوشی کے

تھے۔ اوران میں مٹھاس کی بو تھی۔ یک لخت وہ سنبھلی اور پیچھے ہٹ گئی۔ اُس کا سر نیچے جھک گیا اور وہ بولی "میں تمہارے لئے روتی ہوں اور تمہارے لئے ہی تڑپتی ہوں اس زرجن بن میں میرا کون ہے۔ بیٹھی تمہاری تصویر کو دیکھتی ہوں اور رنج سے آنسو بہاتی ہوں مگر تمہاری جدائی کو اسقدر تلخی کے ساتھ محسوس کرنے پر بھی تمہارے سامنے نہیں آتی۔ مبادا انہیں تکلیف نہ ہو کیونکہ میں ایک غریب پروفیسر کی لڑکی ہوں۔ تم سے انتقام لینا تھا۔ مگر جی نہیں چاہتا"

اتنے میں میری آنکھ کھل گئی۔ مگر وہ دلفریب صورت آنکھوں سے چھپ گئی۔ ترلوچن داس اس سے زیادہ سخت انتقام کیا ہو سکتا ہے کہ میں اُس کی یاد میں تڑپوں، وہ میری یاد میں تڑپے اور پھر ہمارا ملاپ نہ ہو"!

ترلوچند داس نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہا "یہ کانٹے تمہارے ہی بوئے ہوئے ہیں"!



بانکی تلوار

پُرانے وقتوں کی باتیں ہیں۔ کنول پُور سے باہر۔ شہر سے دور درختوں کے درمیان ٹھاکر
سول سنگھ کا اکھاڑہ تھا۔ جس میں دُور دُور سے بانکے۔ راجپوتوں کو اپنی طرف کھینچنے کی کشش
تھی۔ سول سنگھ اُستاد تھے تلوار کے دھنی تلوار کے کرتبوں میں طاق تھے اور اُن کے کرتب
دیکھنے کو لوگ ترستے تھے مگر دیکھنے کا موقعہ کسی خوش قسمت کو ہی ملتا تھا

ہر منگلوار کو ٹھاکر کے شاگردوں کا مقابلہ ہوا کرتا تھا۔ اور یہ وہ دن تھا جب جنگل میں
منگل ہو جاتا تھا۔ بیابان آباد ہو جاتا اور درختوں کی چوٹیاں آدمیوں سے بھر جاتیں۔ زمین پر تل
پھینکنے کو جگہ نہ ملتی۔ کندھے سے کندھا الگ جاتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آدمیوں کا سمندر ٹھاٹھیں
مار رہا ہے اور لہریں درختوں کی چوٹیوں کو چھو رہی ہیں۔

ہونہار کمار اکھاڑے میں کودتے اور پُرشوق نگاہیں اُن کے چہروں پر جم جاتیں اُن کے
کمالات دیکھ کر لوگوں کی طاقت گفتار جاتی رہتی اور اُن کی نظریں زبان کا فرض ادا کر کے ہنر
کی داد دیدیتی تھیں۔ بے صبری سے انتظار کرتے تھے۔ لوگ اُسوقت کا جب ٹھاکر ہاتھ میں
پان کا بیڑا لیکر اکھاڑے میں اُترتے اور سب سے چالاک کمار کو چھاتی سے لگا کر پان اُس کے
ہاتھ میں دیدیتے۔ مرحبا کے نعرے بلند ہوتے۔ آسمان گونج اُٹھتا۔ جب رات کی سائیں سائیں
ہوتی تو بیابان میں بڈھے ٹھاکر کے سوائے کوئی نہ ہوتا۔



(۲)

منگل کا دن تھا۔ بیابان میں رونق ہو رہی تھی۔ ٹھاکر سول سنگھ کے اکھاڑے میں تل پھینکنے

کو جگہ نہ تھی۔ بانکے کمار دل کے ارمان نکالنے کو اور تماشائی دیکھنے کو بیتاب و بے چین ہو رہے تھے کسی کا کلیجہ دھڑکتا تھا۔ اور کسی کی نگاہیں چاروں طرف کچھ دیکھنے کی آرزو میں دوڑتی پھرتی تھیں کسی کا دل ناچتا تھا۔ اور کسی کی آنکھیں ناچتی تھیں۔ وقت مقررہ پر ٹھاکر مول سنگھ آسن پر آ بیٹھے گستاخ اور بے ادب نگاہیں جھک گئیں۔ سر تسلیم خم ہو گئے۔ گھنٹی بجی اور گھنٹی بجنے کے ساتھ ہی چھوٹے چھوٹے کماروں نے اکھاڑے میں کود کر اپنے ننھے ننھے طفلانہ ہاتھوں سے حاضرین کو پرنام کیا۔ اور تیروں کے کرتب دکھانے شروع کئے۔ بچے یونہی پیارے لگتے ہیں۔ مگر جب ان کی معصومیت کے ساتھ کمال کا پیوند لگ جاتا ہے۔ تو سونے میں سے خوشبو نکلنے لگجاتی ہے۔

پھر گھنٹی بجی اب کے نوجوان آگے بڑھے اور خنجر ان کے پہلوؤں میں بیتابی سے تڑپنے لگے استاد نے زبان سے حکم دیا۔ اور ایک دم سات بجلی کے ٹکڑے چمک گئے مصنوعی لڑائی شروع ہوئی اور حاضرین عش عش کرنے لگے مرحبا آفرین کی آوازیں بلند ہوئیں

ٹھاکر مول سنگھ نے تین پان ہاتھ میں لئے اور اکھاڑے میں اترے چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ سانس لینے کی آواز بھی بند ہو گئی۔ ٹھاکر نے کہا۔

"راجپوت نوجوانو! آج کا پہلا پان لینا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ یہ تھالی پر کھڑا ہے۔ اس کے سر پر میں سیب رکھتا ہوں۔ کون بانکا راجپوت ہے جو اس سیب کے تلوار کے ایک وار سے ہی تین ٹکڑے کر دے۔ مگر میرے نور نگاہ کو ٹھیس نہ پہنچے"

خاموشی اور بھی گہری ہو گئی۔ سناٹا اور بھی بڑھ گیا تلوار کے ایک وار سے سیب کے دو ٹکڑے تو ہو سکتے ہیں مگر تین کرنا کچھ معنی رکھتا ہے۔ کسی کو آگے بڑھنے کی ہمت نہ ہوئی آدمیوں کی دیوار بدستور کھڑی رہی ٹھاکر گھبرائے۔ کیا یہ پان میرے ہاتھ میں ہی رہیگا۔ کیا ان سب میں سے راجپوتی شان کوچ کر گئی۔ کیا کوئی بانکا راجپوت آگے نہیں بڑھے گا۔ آہ! یہ شرمندگی وہ شرمندگی ہے جو مرتے دم تک نہ بھولیگی"

ایک کمزور نازک خوبصورت۔ بانکا۔ راجپوت آگے بڑھا۔ تمام نگاہیں اور تمام دل ادھر

جھک گئے۔ بانکی تلوار حرکت میں آئی۔ اور سیب کے تین ٹکڑے ہو گئے نگاہوں سے نگاہیں سرگوشیاں کرنے لگیں۔ ٹھاکر پھول کر کپا ہو گئے۔ یہ نئے شاگرد کا پہلا کرتب تھا۔

(۳)

عام طور پر دنیا میں دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جو دوسروں کی کمالیت کا اعتراف کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جو خوبیاں دیکھ کر ہی ایک شخص کے دشمن بن جاتے ہیں کسی شخص میں خوبیاں ہونا ہی اُن کو دشمن بنانے کے لئے کافی ہے۔ امید سنگھ بھی اسی طرح کا جوان تھا۔ تلوار۔ نیزے۔ خنجر کے کرتبوں میں وہ دُور دُور تک مشہور تھا۔ تیر چلانے میں اُس کا ثانی نہ ملتا تھا۔ مگر جب اُس کی موجودگی میں ایک کمزور دُبلا پتلا نوجوان بازی لے گیا۔ تو اس کے غصّے کی حد نہ رہی۔ اُس نے ہونٹ کاٹے۔ زبان کاٹی اور دانت پیس کر خون کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ بانکی تلوار اُس کی نگاہوں میں کھٹکنے لگی۔ اُس نے کہا نہیں بلکہ عہد کیا کہ ایک ماہ کے اندر اندر دُنیا میں نہ تو بانکی تلوار رہے گی اور نہ تلوار والا۔ ان زہریلے خیالات کو دل میں لگر مصری ایسے میٹھے الفاظ کو اپنی زبان پر لئے ہوئے وہ بانکی تلوار والے نوجوان راجپوت کو ملا۔ کچھ تعریف کی کچھ شوق جتلایا اور راہ و رسم پیدا کرنے کی فکر میں ہوا۔ مگر بانکی تلوار کے بانکے وحشی نے باتوں باتوں ہی میں اُڑا دیا۔ نہ تو اُسے اپنے مکان کا پتہ دیا اور نہ ہی اُس سے کچھ اقرار کیا۔ گھوڑے کو ایڑی لگائی۔ اور یہ جا وہ جا نظروں سے غائب ہو گیا نگاہیں اِدھر اُدھر گئیں۔ مگر ناکامیاب و نامراد واپس پلٹنا پڑا۔

(۴)

ایک ماہ گذر گیا۔ اس عرصے میں پریم سنگھ کی بانکی تلوار کے افسانے ہوا میں اُڑنے لگے۔ کھیتوں میں ہل چلانے والے جاٹ ندیوں کے کنارے ناؤ کھینے والے ملاح۔ پان لگانے والے تنبولی اور گلیوں میں کھیلنے والے لڑکے جب اکھٹے ہوتے تو بانکی تلوار کی داستانیں چھڑ جاتیں۔ اور بانکی تلوار کے مالک کو آسمان پر چڑھا دیا جاتا۔ پریم سنگھ خوبصورت تھا

اور نازک تھا۔ اُس کی اداؤں کی بھبن نے اپنے آپ کو بہت جلد ہر دلعزیز بنا لیا مگر وہ سب سے علیحدہ سب سے الگ تھلگ رہا کرتا تھا۔ اور لوگوں میں زیادہ ملنا جلنا اُسے پسند نہ تھا۔

امید سنگھ نے جب مہینہ ختم ہوتا دیکھا۔ اور دیکھا کہ پریم سنگھ نظروں سے غائب ہو رہا ہے تو اس نے بھی گھوڑے کو ایڑی لگائی۔ اور ہوا ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ دو کوس کے فاصلے پر جاکر پریم سنگھ نے گھوڑا روک لیا۔ اور کہنے لگا۔

"آپ میرے ساتھ بہت دُور سے آ رہے ہیں ......"

امید سنگھ نے بات کاٹ کر کہا "آپ جانتے ہیں میرے تعاقب کرنیکا مطلب کیا ہے۔ خیال نہ دوڑائیے مجھ سے پوچھیے۔ آپ نے میری نیکنامی کو مٹا دیا۔ میری بہادری کو بٹہ لگا دیا۔ ہر ہفتہ کو میرے ہونٹ لال ہوئے تھے۔ اب جب سے آپ آئے ہیں۔ مجھے پان لینا نصیب نہیں ہوا۔ یہ کچھ شرم کی بات نہیں ہے!"

پریم سنگھ مسکرایا "لیجئے پان آپ کی نذر ہے مجھے کچھ شوق نہیں۔"

امید سنگھ کا چہرہ غصہ سے تمتما اُٹھا۔ ان نزاکتوں کو رہنے دو۔ اسوقت تلوار نکال کر سامنے آجاؤ۔ جو بچ رہیگا۔ وہ ہونٹوں کو بھی رنگے گا۔ اور کپڑوں کو بھی ہونٹ پان سے اور کپڑے خون سے۔"

پریم سنگھ نے اطمینان سے تلوار نکالی۔ اور کہا "بہتر ہے یہ خون نہ بہایا جاوے کیا اس کے بغیر چارہ نہیں؟"

امید سنگھ نے کہا "ہرگز نہیں" اور لوہے سے لوہا بجنے لگا۔ تلواریں چمکنے لگیں اور کھڑکھڑاہٹ سے آسمان گونجنے لگا۔ امید سنگھ مغلوب ہوا۔ اور اس کا سر خاک میں لوٹنے لگا۔ ابھی پریم سنگھ کی بانکی تلوار نیام میں واپس نہ گئی تھی۔ کہ گھوڑوں کے سموں کی آواز سنائی دی اور پانچ سوار ننگی تلواریں کھینچے پریم سنگھ پر ٹوٹ پڑے۔ وہ غصہ سے بھرے ہوئے تھے۔ اور اپنے دوست امید سنگھ کی موت کا بدلہ لینے کو تڑپ رہے تھے۔ پانچ سواروں کے مقابلے میں ایک بانکی تلوار حرکت کر رہی تھی۔ اور پانچوں حیرت و استعجاب میں تھے۔

ایک مرا۔ دو مرے۔ تین مرے۔ چار مر گئے۔ اب ایک سے مقابلہ تھا۔ پریم سنگھ کی مہین باریک آواز ہوا میں گونجی اور اُس نے مسرت کا نعرہ مارا۔

(۵)

یہ پانچواں سوار سب سے زبردست تھا جس کا آدھ گھنٹے سے زیادہ مقابلہ کرنا پریم سنگھ کو مشکل ہو گیا۔ وہ ہانپ گیا۔ اور کہنے لگا "ذرا دم لے لوں"!

حریف جوش میں اندھا ہو رہا تھا۔ قانونِ جنگ کو فراموش کر کے کہنے لگا۔ دم اب ہمیشہ کے لئے ہی لے لو۔ ذرا سے کی کیا ضرورت ہے"! اور تلوار کا وار کیا۔

پریم سنگھ نے وار کو خالی دیا اور کہا "راجپوت! پانچ آدمیوں سے لڑ تا رہا ہوں۔ کیا تمہیں شرم نہیں آتی۔ کہ ذراسی بات کو بھی منظور نہیں کرتے"!

"کبھی نہیں" حریف نے کہا۔ اور پھر وار کیا۔

پریم سنگھ کا بازو سُست پڑ گیا۔ اور وہ لڑنے کے ناقابل ہو گیا۔ درختوں کے پتوں سے سرسراہٹ کی آواز کے ساتھ ہی ایک راجپوت جوان نکلا اور حریف پر حملہ آور ہوا۔

حریف نے حملہ آور کو دیکھا خوف سے تھرتھر کانپا اور بھاگ نکلا۔

پریم سنگھ نے کہا "اے نیکی کے فرشتے! میں تیرا مشکور ہوں"۔ ابھی نووارد نے کوئی جواب نہ دیا تھا۔ کہ پریم سنگھ نقاہت سے بیہوش ہو گیا۔ اجنبی نے ہوا دینے کے لئے اس کا چغہ کھول دیا۔ اور چغہ کھولتے ہی پانچوں انگلیاں اُس کے منہ میں پڑ گئیں۔ پریم سنگھ عورت تھی۔

نووارد اُس کے چہرے کو تاکتا رہا۔ اور اُس کی پچھلی بہادریوں اور اُس وقت کی جانبازیوں کو یاد کر کے حیران ہو تا رہا۔ وہ خود بہادر تھا۔ اور بہادری کا عاشق تھا۔ اس بانکی تلوار والی عورت کو دیکھ کر اُس کیلئے اُس کے دل میں محبت کا دریا موجزن ہو گیا۔

(۶)

یہ خبر بگولے کی طرح اُڑی اور آندھی کی طرح پھیلی کہ پریم سنگھ مرد نہیں عورت ہے جسے

سُنا وہی حیران ہوا۔ مگر کرم سنگھ کی تو حالت ہی کچھ کی کچھ ہو گئی تھی۔ آٹھ دن وہ منٹ منٹ گن گن کر کاٹتا۔ اور جب منگلوار کا سورج اپنی پہلی کرن اُسپر پھینکتا۔ تو اُس میں نئی روح اور نئی زندگی آجاتی۔ وہ جسم پر ہتھیار سجاتا۔ تلوار باندھتا۔ تیر کمان ہاتھ میں لیتا۔ اور ہاتھی کی طرح جھومتا جھومتا کنول پور سے باہر نکلکر مول سنگھ کے اکھاڑے کا راستہ لیتا۔ پریم کماری (پریم سنگھ) اکھاڑے میں اُترتی اور اپنے کرتب دکھاتی۔ تو کرم سنگھ کا دل کنول کی طرح کھل جاتا۔ پریم کماری کی نگاہیں کرم سنگھ کی نگاہوں سے سرگوشیاں کرتیں۔ ایک طرف سے فخر کیا جاتا۔ دوسری طرف سے اعتراف کیا جاتا۔ پریم کماری مُسکرا کر کرم سنگھ کے پاس آجاتی۔ لوگ گھروں کا رستہ لیتے۔ اور وہ دونوں محبت کے تاگے سے باندھے ہوئے جنگل کی طرف جاتے سیر کرتے اور پھر جدا ہو جاتے۔ اور ایک ہفتہ تک ایک دوسرے سے جُدا ہی رہتے۔

(۷)

سینکڑوں دلوں نے محسوس کیا۔ اور سینکڑوں آنکھوں نے چاروں طرف پریم کماری کو ڈھونڈا مگر وہ نظر نہ آئی۔ کھیل ہوتے رہے کرتب ہوتے رہے مگر اسدن کچھ رس نہ تھا۔ پریم کماری کی مسکراہٹ اکھاڑے کو پھولوں کا کنج بنا دیتی تھی۔ آج وہاں چاروں طرف محض گھاس تھی۔ پھولوں کی بُو باس نہ تھی۔ جب تیل میں بتی پڑی اور لوگوں نے اپنے اپنے گھر کا راستہ لیا۔ تو کرم سنگھ کی آنکھوں میں دُنیا تاریک ہو رہی تھی اور قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ وہ ایک درخت کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ اور رات کے ۱۲ بجے تک کھڑا رہا۔ وہ اپنے آپ کو۔ اور ارد گرد کے حالات کو بھول گیا ہوا تھا۔ اور دُنیا کا اُسے کچھ پتہ نہ تھا۔

درختوں کے درمیان ایک جھونپڑی میں پریم کماری بندھے ہوئے ہاتھ پاؤں کے ساتھ فرش پر پڑی تھی۔ اور اُس کے سامنے اُمید سنگھ کا چھوٹا بھائی بدمعاش شامو بیٹھا تھا۔

شامو "پیاری پریم کماری! تیری جان میرے ہاتھ میں ہے!"

پریم کماری:" مگر میری عصمت میرے ہاتھ میں ہے "

شامو:" تو جان گنوا بیٹھے گی "

پریم کماری:" مگر دھرم سلامت رہیگا "

شامو۔(تو میری بن جا"

پریم کماری:" خبردار یہ الفاظ پھر نہ کہنا۔ لعین پاجی مجھے چھوڑ دے۔ دھوکے باز شرارتی ہٹ جا"

شامو:"غصہ سے دانت پیسکر" بیوقوف زبان دراز مغرور لڑکی سمبھل جا ورنہ میری تلوار تیرا خون چاٹے بغیر نہ رہیگی "

پریم کماری:" کیا ہے موت سے کسے ڈراتا ہے۔ مگر ہاں ایک افسوس رہیگا "

شامو:" کیا۔ میں بھی تو سنوں "

پریم کماری:" وہ یہ کہ میں ایک بزدل ڈرپوک بدمعاش کی تلوار سے شہید ہو رہی ہوں "

شامو۔(تلوار کھینچکر)" اچھا اگر تیری یہی خواہش ہے تو جہنم رسید ہو جا"

یہ کہکر اس نے تلوار اس کے گلے پر رکھدی۔ پریم کماری اچھلی۔ تلوار اس کے سینے پر لگی۔ اور وہ بیتاب مچھلی تڑپنے لگی۔ دروازہ کھلا۔ اور کرم سنگھ اندر داخل ہوا۔ پریم کماری نے اشارے سے اُسے اپنے پاس بلایا اور باہیں گلے میں ڈالدیں۔ کرم سنگھ نے مرنیوالی تصویر کو پیار کیا۔ مرنے والی تصویر نے کرم سنگھ کو پیار کیا۔ اور تب موت نے دونوں کو جدا کر دیا۔ پریم کماری کے مردہ قالب کو دیکھ کر کرم سنگھ نے اپنی تلوار سے اپنا سر کاٹ لیا۔ دروازہ پھر کھلا۔ اور مول سنگھ ٹھاکر اندر داخل ہوئے دو اکھاڑے کے زیوروں کو مٹی میں ملا دیکھ کر سرد آہیں اُن کے سینے سے نکل گئیں "

دروازہ پھر کھلا۔ اور ایک براہمن اندر داخل ہوا۔ پریم کماری کو دیکھ کر وہ زار زار رونے لگا۔ ٹھاکر مول سنگھ نے پوچھا "

" مہاراج یہ آپ کی کون تھی "

پنڈت نے رو کر جواب دیا "یہ میری کوئی نہیں تھی۔ مگر میں نے اس کو بیٹیوں کی طرح پالا تھا
آج سے تیرہ سال پہلے یہ تین برس کی مجھے جنگل سے ملی تھی"

مول سنگھ بیتاب ہو گئے اور کہنے لگے "اُسوقت اس کا لباس کیسا تھا"
پنڈت جی نے ایک پلندہ سا پھینک دیا۔ مول سنگھ نے اُسے کھولا۔ لباس دیکھا۔ اور چیخ چیخ کر رونے لگے "آہ! میری گمشدہ بیٹی۔ تو تم ہو کر مجھے اُسوقت ملی۔ جب تو دُنیا سے گم ہو چکی ہے۔ پہلے تو مجھے تیرے ملنے کی اُمید تھی بھی۔ اب بالکل ٹوٹ گئی ہے"

شامو بھاگ چکا تھا۔ مگر پریم کماری کی بانکی تلوار کو جھونپڑی میں ہی چھوڑ گیا تھا ٹھاکر مول سنگھ جب تک جیتے رہے۔ بانکی تلوار اُن کے اکھاڑے میں لٹکتی رہی۔ اور نئے شاگرد شاگرد بنتے وقت اُس تلوار کو پرنام کرتے تھے!

راجپوتنیوں کے ہاں جب بچے پیدا ہوتے تھے تو اُس بانکی تلوار کو دھو کر دھوون بچے کے سر پر ڈالا جاتا تھا۔

جوان کنواری بچیاں تلوار کو لٹکتا دیکھتی تھیں۔ تو ادب سے سر جھکا دیتی تھیں۔ بڑھے بڈھے راجپوت اسے دیکھتے تو بانکی لڑکی کی تصویر اُن کی آنکھوں میں پھر جاتی وہ محسوس کرتے اور کہتے کہ بانکی تلوار والی دُنیا میں نہیں مگر اُس کی یادگار زندہ ہے

آہ! آج وہ یادگار بھی صفحہ ہستی سے مِٹ چکی ہے۔

پاسِ سخن

ایک عالیشان محل کے دلھن کی طرح سجے ہوئے کمرے میں دو محبّت کی زندہ تصویریں
و الفت کے بیقرار متوالے۔ دوسر زمین بچپن کے واسی ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے تھے
ن کی نگاہوں سے ایک دوسرے کے لئے محبّت کا سندیسہ نکلتا تھا۔ اور چہروں پر بچپن
کی معصومیّت جھلکتی تھی۔ ان میں سے ایک لڑکا تھا۔ ایک لڑکی تھی لڑکے کی عمر بارہ برس
کی اور لڑکی دس برس کی تھی۔ لڑکے کا نام نریندر اور لڑکی کا شانتی تھا۔ نریندر نے شانتی
کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

"شانتی اب تم چلی جاؤ گی۔ پھر کب آؤ گی؟"

شانتی نے پیار سے نریندر کی طرف دیکھ کر کہا "معلوم نہیں پتا جی کب تک واپس ہوں۔
جب آؤں گی تمہارے لئے نئی نئی چیزیں لاؤں گی۔"

نریندر نے آہستہ سے کہا "کلکتہ بڑا شہر ہے۔ وہاں جاکر تم مجھے بھول جاؤ گی اور میں
اس چھوٹے سے قصبے میں اکیلا سڑتا رہوں گا۔ شانتی تم جانتی ہو۔ مجھے تم سے اتنی محبت ہے
جتنی اپنی سگی بہن سے بھی نہیں ہے۔"

شانتی نے جواب دیا "مجھے بھی تم سے بہت محبّت ہے۔ کہو مجھے بھول تو نہ جاؤ گے؟"

نریندر نے شانتی کے معصوم چہرے کی طرف دیکھ کر کہا "یہ کبھی ہو سکتا ہے۔ زمین پلٹ جائے
اور آسمان بدل جائے۔ مگر نریندر شانتی کو نہیں بھول سکتا۔ یہ ناممکن ہے اور بالکل ناممکن ہے۔
بہن شانتی! میں جب سکول سے پڑھ کر آیا کروں گا۔ تو کون مجھے مسکراتے ہوئے چہرے پر شوق
بھری نگاہوں اور محبت بھری نگاہوں سے خوش آمدید کہیگا۔ میں جب سکول کی پڑھائی سے تھک کر

چار پائی پر گر جایا کروں گا۔ تو کون مجھے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے آ کر چھیڑا کرے گا۔ گھر سے ناراض ہو کر میں کس کے پاس دل بہلانے کو جایا کروں گا۔ رات کو کسے کہانیاں سناؤں گا۔ اور کس سے پہیلیاں سنوں گا۔ جنم کے بھائی بہنوں میں بہت محبت ہوتی ہے۔ مگر دھرم کے بھائی بہنوں میں اور بھی زیادہ محبت ہونی چاہئے کیونکہ جنم کے بھائی بہن تو قدرت نے بنا دئے ہیں اور ہم اُس میں کچھ کر نہیں سکتے۔ لیکن دھرم کے بھائی بہن ہم آپ اپنی مرضی سے دیکھ بھال کر بنتے ہیں۔ شانتی تو میری دھرم کی بہن ہے دیکھنا بڑے شہر میں جا رہی ہو۔ مجھ غریب نریندر کو بھول نہ جانا!"

شانتی کی پھول جیسی آنکھوں سے آنسو بہ کر اُس کے رخساروں پر ڈھلکنے لگے۔ دیوار پر لگے ہوئے کلاک نے آٹھ بجائے اور نریندر نے گھبرا کر شانتی کو گلے سے لگا لیا۔ اُس کے آنسو پونچھے اور کہا "بہن! اب رونا موقوف کرو۔ لو آٹھ بج گئے۔ تمہارے پتا آتے ہوں گے۔ گاڑی تیار ہو گی"

شانتی بیتاب ہو کر بلک بلک کر رونے لگی۔

اتنے میں اُس کا پتا ستیش چندر اندر داخل ہوا۔ اور کہنے لگا "او ہو! شانتی تم رو رہی ہو کیوں۔ نریندر سے جُدا ہونیکا خیال ہے کیا۔ ہم تو چار ماہ تک واپس آجائینگے۔ نریندر بہن کو چُپ کراؤ۔"

یہ کہکر وہ باہر چلے گئے۔

گاڑی تیار ہوئی۔ ستیش چندر۔ اس کی عورت۔ موہنی بیٹی شانتی۔ بیٹا دیوندر سب سوار ہوئے۔ بیل گاڑی آہستہ آہستہ ہچکولے کھاتی ہوئی روانہ ہوئی۔ اور نریندر چپ چاپ کھڑا رو یا کیا۔ رو یا کیا۔ بس رو یا کیا۔

﴿ ۲ ﴾

چندر پور ایک چھوٹا سا قصبہ کلکتے سے پچاس میل کے فاصلے پر ہے۔ نریندر اور شانتی

وہیں کے رہنے والے تھے۔ نریندر کے باپ معمولی درجے کے آدمی تھے۔ اور معمولی درجے کے مکان میں معمولی طور پر رہتے تھے۔ مگر شانتی کے پتا ستیش چندر کے پاس روپے کی پرواہ نہ تھی۔ اچھا کھاتے تھے۔ اچھا پہنتے تھے اور اچھا پہنتے تھے۔ مکان کے ساتھ مکان ملتا تھا۔ دونوں بچوں میں محبت ہو گئی اور ہر دم اکٹھے رہنے لگے۔ کھانا۔ پینا۔ پڑھنا۔ لکھنا۔ ہنسنا۔ کھیلنا سب ایک ساتھ ہونے لگا۔ نریندر کے بغیر شانتی۔ اور شانتی کے بغیر نریندر کا دل اچاٹ ہو جاتا تھا۔ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں سے سولہ گھنٹے وہ اکٹھے ہی رہتے تھے۔ ستیش چندر نے گاؤں کو چھوڑ کر کلکتے میں جانے کا فیصلہ کیا۔ اور وہیں ایک کارخانہ کھول دیا۔ نریندر اکیلا رہ گیا۔ وہ قصبے سے دو میل کے فاصلے پر آہستہ آہستہ بہنے والی ندی کے کنارے جا کر پہروں بیٹھا رہتا تھا۔ اور شانتی کو یاد کرتا۔ ایک ایک دن کر کے مہینہ گذر گیا۔ مگر کلکتے سے کوئی خط نہ آیا۔ نریندر حیران تھا۔ کہ بات کیا ہے۔ پھر سوچا۔ وہ امیر کی بیٹی۔ ہم غریب کے بیٹے۔ ہم میں اور اس میں محبت کیسی بھول گئی ہوگی۔ چلو جانے دو۔ مگر دل نے کہا۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ تم بھول جاؤ۔ شانتی مجھے نہیں بھول سکتی۔

(۳)

یقیناً آپ نے مجھے نہیں پہچانا"

یہ الفاظ سن کر نریندر حیرت سے اجنبی کی طرف دیکھنے لگے۔ اس کی شکل وصورت۔ اور اس کی آواز شناسا سی معلوم ہوئی۔ مگر یہ کون ہے۔ یہ یاد نہ آیا۔ جب اجنبی نے آکر ہاتھ سے اشارہ سے سلام کی۔ اور نریندر نے کرسی دیکر کہا۔ تشریف رکھئے تو اجنبی نے معاً کہا۔

"یقیناً آپ نے نہیں پہچانا!"

نریندر نے غور سے اس کی طرف دیکھنا شروع کیا وہ تاکتے رہے اور تب تک تاکتے رہے جب تک کہ چلا نہ اٹھے "ہیلو مسٹر دیو بندر ناتھ"

دیو بندر ناتھ نے اپنے آپ پرانے بچپن کے دوست نریندر کے گلے سے لگا ہوا محسوس

گیا کہ میں باپ کی گود میں آ گیا۔ خوشی سے نریندر کا دم پھول گیا۔ اور مسکرا کر بولے ۔
"دیویندر کہو۔ راضی رہے۔ آج کا دن تو بڑا مبارک ہے کہ پندرہ سال کے بعد تمہارے درشن ہوئے!"

پہلے خیال نہ کیا تھا۔ اب جو دیکھا۔ تو دیویندر کے کپڑوں سے بدبو آ رہی تھی۔ امارت کی شان لٹ چکی تھی۔ اور عشرت کی جگہ عسرت و نحوست نے لے لی تھی۔ بال بہت بڑھ گئے تھے اور چہرے پر میل جم رہی تھی دیویندر کا پنا سمٹا۔ سکڑا اور کہنے لگا۔ ہاں اچھے رہے"
نریندر بھانپ گئے۔ میلے کپڑے اسے بات کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ ردی حالت ہونے سے آدمی اپنی نظروں میں آپ گر جاتا ہے۔ بات بات میں ہچکچاتا ہے اور قدم قدم پر بدکتا ہے نریندر نے نوکر کو کہا "انہیں لیجا کر غسل کراؤ اور کپڑے بدلوا لاؤ" احسا مندانہ نگاہوں سے دیویندر نریندر کی طرف دیکھنے لگا۔ مگر نریندر نے دھیان دوسری طرف کر لیا۔ نہا دھو کر اور کپڑے بدل کر جب دیویندر کے پاس آیا۔ تو نریندر نے کہا "دوست! پندرہ سال گذرے جب ہم تم اکٹھے رہتے تھے۔ آہ وہ دن بھی کیسے عجیب تھے۔ جو آج ہاتھ نہیں آتے"
دیویندر نے کہا "اچھا ہوا۔ آپ پلیڈر بن گئے۔ ان پندرہ سالوں کی آپ کو کیا ضرورت ہے"
نریندر نے کہا کاش وہ زمانہ مجھے پھر مل جائے۔ اس پر سے ایسی لاکھ وکالتیں نثار کی جا سکتی ہیں۔ جب میں بچہ تھا۔ اور بچوں کے ساتھ کھیلتا تھا۔ سادگی کا زمانہ چلا گیا۔ پاکیزگی کے جذبات رخصت ہو گئے۔ کہو میری بہن شانتی کہاں ہے۔ اسے دیکھنے کو میرا دل تڑپتا ہے اور آنکھیں ترستی ہیں"

دیویندر کی آنکھوں سے آنسو کا قطرہ ٹپک پڑا اور اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "وہ اسی دن سے غائب ہے جس دن سے ہم نے چندر پوری چھوڑا گاڑی میں ہی اسے کوئی لے گیا۔ ہزار ڈھونڈا۔ لاکھ کوشش کی مگر وہ نہ ملنی تھی نہ ملی۔ پتا اور ماتا دونوں اس کی جدائی میں تڑپ تڑپ کر مر گئے۔ اور مجھ بدنصیب کو تڑپنے کے لئے چھوڑ گئے"

نریندر کے سینے میں گھونسہ لگا۔ اُنھوں نے ہونٹ دانتوں سے دبائے۔ اور ہوا میں پاگلوں کی طرح دیکھنے لگے۔

(۴)

دیویندر غریب تھا۔ بدمعاش تھا۔ اور عیاش تھا۔ عیاشی امیروں کا زیور ہے۔ مگر غریبوں کے لئے سم قاتل ہے۔ غریبوں کے لئے سو عیبوں کا عیب تو غریب ہونا ہی ہے امیروں کے عیب سب ڈھک جاتے ہیں اور امارت کا پردہ اُن کو کھلنے نہیں دیتا۔ مگر غریب ذرا ادھر ادھر ہوا نہیں۔ اور اُس کی موت آئی نہیں۔ اس حالت میں جبکہ دیویندر اس طرح دربدر ٹکریں کھا رہا تھا۔ اور ٹکڑے ٹکڑے کے لئے مارا مارا پھرتا تھا۔ نریندر نے اُسے پکڑ کر کلیجے سے لگالیا۔ اور جو سلوک سوداما سے کرشن نے کیا تھا۔ وہی سلوک نریندر نے دیویندر سے کیا۔ نریندر۔ اب کھاتے پیتے آدمی تھے۔ کسی چیز کی پرواہ نہ تھی۔ مکان کے اندر ریشمی پردے لٹکتے تھے۔ اور دروازے پر گھوڑے ہنہناتے تھے۔ ٹانگے میں چڑھ کر جب باہر نکلتے۔ تو لوگ اُنپر انگلیاں اٹھاتے تھے۔ نریندر محض وکیل ہی نہ تھے۔ اُن کی علمی لیاقتوں نے بھی عوام میں اُن کو ممتاز بنادیا تھا۔ اُن کے مضامین مشہور ترین اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے تھے۔ اور شوق سے پڑھے جاتے تھے اُن کے مضامین دیکھکر ہی ساگر اُنپر عاشق ہوگئی تھی۔ اور چونکہ وہ خود بھی لکھنا جانتی تھی اس لئے جلدی دونوں طرف ایک سی آگ لگ گئی۔ اور دونوں دل ایک ہی تیر سے زخمی ہوگئے۔

سانپ کا کام اپنے پالنے والے کو کاٹنا ہے۔ یہی عادت دیویندر میں تھی۔ دیویندر کچھ بھی نہ تھا۔ اگر نریندر اسے پکڑ کر اونچا نہ اٹھالیتا۔ مگر دیویندر نے اُسے سانپ بن کر کاٹا اور بچھو بن کر ڈنک لگایا۔

شام کا وقت تھا۔　　ساگر تن تنہا نریندر کے کمرے میں داخل ہوئی۔ مگر چونکہ وہ مکان پر نہ تھے ۔اس لئے نہ ملے۔ دیویندر نے ساگر کو دیکھا۔ اور اُس کی نیت بد ہوگئی۔ یہ بدخیال دل میں

ٹ رہا۔ زبان پر آگیا۔ اور زبان سے ہاتھوں پر پہنچا۔ جب ساگر کو دیویندر نے کلائی سے پکڑ لیا ساگر کا منہ لال ہوگیا۔ اور اُس نے کہا "دیویندر میں تجھے شریف سمجھتی تھی۔ مگر تم بدمعاش نکلے۔ تم بگلے کی طرح بھگت بن رہے ہو۔ مگر مچھلی کو دیکھتے ہی بیتاب ہو جاتے ہو۔ تم جس شاخ پر بیٹھتے ہو۔ اُسی کو کاٹتے ہو۔ جس تھالی میں کھاتے ہو۔ اُسی کو توڑتے ہو۔ یہ شرافت نہیں۔ خبردار مجھے ہاتھ نہ لگانا جانتے ہو۔ میرا باپ بیرسٹر ہے اگر ایسی ویسی بات ہوئی۔ تو تم کو جیلخانہ کی ہوا ضرور کھانی پڑیگی۔ اور مجھ سے ...... مجھ سے تو کچھ اُمید ہی نہ رکھو۔ ذرا ہاتھ بڑھاؤ۔ اور یہ چاقو میرے سینے کے پار ہو جائیگا۔"

یہ کہہ کر ساگر چُپ چاپ کھڑی ہوگئی۔

دیویندر اندھا ہو رہا تھا۔ جوش نے اُسے آگے کیا۔ ساگر نے گھبرا کر چیخ ماری اور ایک لمبا ساجوان کمرے میں داخل ہو کر بولا۔ کیا ہے؟

(۵)

نریندر نے پانی والے کی دوکان سے پانی پی کر چلنے کا ارادہ کیا ہی تھا۔ کہ ساتھ کی ٹوٹی ہوئی دُکان پر پڑی ہوئی خستہ سی چارپائی پر لیٹی ہوئی ایک عورت نے کہا "بابو میں غریب عورت ہوں اور قریب المرگ ہوں۔"

نریندر نے فوراً پہچان لیا یہ موت کے کنارے بیٹھی ہوئی عورت اُن کی بچپن کی رفیقہ مُنہ بولی بہن شانتی ہے۔ اُن کا دل بھر آیا۔ وہ بے اختیار آگے بڑھے۔ اور کہنے لگے "شانتی تم کہاں ہو؟"

یہ کہا۔ اور مرنے والے کے گلے سے لپٹ گئے شانتی بھی روئی اور نریندر بھی روئے اور دیکھنے سُننے والے بھی روئے۔ ٹانگا طیار تھا۔ شانتی کو اُس میں لٹایا گیا۔ جب دونوں مکان پر پہنچے۔ تو ایک لمبا ساجوان کمرے سے نکلتا دکھائی دیا۔ نریندر نے کہا تم کون ہو؟ شانتی نے اُسے دیکھا اور اُس کے بے جان قالب میں طاقت آگئی۔ وہ اچھلی اور اچھل کر اُس جوان کے سینے

سے لپٹ گئی۔ نریندر حیران تھے۔ اور اندر سے نکلنے والی ساگر حیران تھی۔ دیویندر حیران تھا اور گھر کے نوکر چاکر حیران تھے۔ دونوں عاشق و معشوق جب رو چکے اور جب اُن کے دل کا غبار نکل چکا۔ تو وہ دونو جدا ہوئے اور آنکھیں شرم سے نیچی کرکے کھڑے ہو گئے۔ شانتی کی آدھی بیماری دُور ہو چکی تھی اور اب تندرستی کا رنگ اُس کے چہرے پر جھلکتا تھا۔ شانتی نے کہا "بھائی نریندر اور دیویندر آج مجھے وہ وقت یاد آتا ہے۔ جب میں چندر پوری سے کلکتے کو روانہ ہوئی تھی۔ اور وہ وقت بھی یاد آتا ہے جب مجھے ایک سادھو نے والدین کی نظر بچا کر ایک سٹیشن پر اُتار لیا تھا۔ قصہ لمبا ہے۔ ایک بوڑھے مہاتما نے مجھے اُس چنڈال سے چھڑا لیا۔ اور اپنے گھر رکھا۔ مگر مثل مشہور ہے۔ بھیڑیئے بھیڑ کے لباس پھرا کرتے ہیں۔ جب میں پندرہ سال کی ہوئی۔ بڈھے بابا کی نگاہ پھر گئی۔ میں وہاں سے نکلی۔ کدھر جاتی۔ اور کہاں جاتی۔ کچھ پتہ نہ تھا۔ ایک نوجوان گریش نے میری بہت مدد کی۔ کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ میرا حسن ہی میرا دُشمن ہو گیا۔ جدھر جاتی تھی اُدھر سے آوازے کسے جاتے تھے تین مواقع پر گریش نے میرے لئے جان خطرے میں ڈال دی۔ ایک دفعہ جو اُن سے بچھڑی تو پھر مل نہ سکی۔ بہتیرا ڈھونڈا پتہ نہ ملا۔ اب مرنے والی تھی۔ کہ تم ملے اور اُس کے بعد بھی وہ مل گیا جسے میری آنکھیں ڈھونڈتی تھیں۔ اور دل ڈھونڈھتا تھا!"

گریش نے کہا "اب مجھے بھی کچھ کہنا ہے۔ اور یہ بتلائے بغیر کہنا ہے کہ میں نے پہلی ہی ملاقات میں اپنا دل شانتی کے حوالے کر دیا تھا۔ اور چونکہ وہ عصمت مآب لڑکی تھی۔ اور ہے اس لئے میرا دل اُسے خواہ مخواہ پیار کرنے لگا۔ اس سے جدا ہو کر میں بہت دنوں تک بھٹکتا رہا۔ مگر پتہ نہ چلا۔ آج مجھے معلوم ہوا۔ کہ شانتی کا بھائی یہاں تمہارے پاس ہے اس لئے ادھر آ گیا مگر یہاں کچھ ہی بات پیش نظر ہوئی"

"وہ کیا؟ وہ کیا؟" شانتی اور نریندر نے کہا۔ اور دیویندر بھاگنے کے لئے راستہ دیکھنے لگا ساگر نے کہا "اب بھاگتے کیوں ہو؟ ذرا ٹھہرو دیکھئے صاحب یہ صاحب میری عصمت پر

ہاتھ ڈالنا چاہتے تھے۔ پرماتما بھلا کرے۔ بابو گریش کا جس نے مجھے اس قصائی سے بچا لیا۔"
نریندر خاموش رہے کچھ نہ بولے۔ دوسرے دن دیویندر بھاگ گیا۔ اور پھر واپس نہ آیا۔
کوئی پندرہ دن کے بعد شانتی اور گریش کی شادی ہو گئی۔ نریندر نے دل کھول کر روپیہ خرچ کیا۔ اور اپنے خرچ پر گریش کو بیرسٹری کے لئے ولایت بھیج دیا۔
شانتی نے کہا۔" آپ نے میرے لئے بڑا خرچ کیا۔"
نریندر نے مسکرا کر کہا۔ کیا تم میری بہن نہیں ہو؟ اور اپنے بہنوئی کو کون اچھی حالت میں دیکھنا نہیں چاہتا۔"
لوگ کہتے ہیں کہ نریندر کو اپنے سخن کا بڑا پاس ہے۔

لوہے کا دِل

آخر کار لکشمن نے پرچارک بننا منظور کر لیا۔ اور کاغذ پکڑ کر وہ چند سطور لکھ دیں جنہوں نے اُسکے والدین کی اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔ سارے خاندان کی نگاہیں اُس کے چہرے پر شاندار مستقبل کی تلاش کر رہی تھیں۔ سیاہی کے چند قطرے کاغذ پر ٹپکے۔ اور وہی شاندار مستقبل جس پر مال و زر نثار ہو رہے تھے۔ رات کی طرح سیاہ اور قبر کی طرح اُداس ہو گیا۔ باپ نے سُنا اور سر پیٹ لیا۔ بھائیوں نے ہاتھ ملے۔ ماں کو غش آ گئی۔ اور یار دوستوں نے رنج اور افسوس کے آنسو بہائے۔ تکلیفوں، آفتوں اور مصیبتوں سے بیٹا ایم۔ اے ہوا تھا۔ اب خیال تھا کہ افلاس کٹے گا۔ مصیبت کے بادل لکشمن کے ہاتھ کے اشارے سے چھن بھن ہو جائینگے۔ اب بڈھا رامچند بھولا رامچند نہ رہیگا۔ جس کی شکل سے نحوست برستی تھی۔ اور مکان میں افلاس کا ڈیرا تھا۔ بیٹا سو ڈیڑھ سو لیگا۔ تو باپ کی حالت بدلجائیگی اور قدر و منزلت اس کے سر پر اقبال کے موتی برسائینگے۔ تصور ہی تصور میں بڈھا رامچند سُنار کی دُکان پر بیٹھکر اپنی آنے والی بہو کے لئے نئے نئے فیشن کے زیور بنواتا تھا۔ اور درزی سے عُمدہ عُمدہ کپڑے تیار کرواتا تھا۔ اور تصور کی نگاہ سے مستقبل کی تاریکی میں دیکھتا تھا۔ تو اُسے فرش پر چادریں اور دیواروں پر ریشمی جھالریں لٹکی نظر آتی تھیں کہیں خوبصورت تصویریں دکھائی دیتی تھیں۔ تو کہیں امیرانہ چکیں نظر آتی تھیں باپ یہ خواب دیکھ رہا تھا۔ جب یکایک آنکھ کُھل گئی خوشی کی جگہ رنج نے لے لی اور اُس نے آنکھوں کو مل کر بیداری کا یقین کرنا چاہا۔ کیا یہ بات درست ہے؟

پاروتی پاس کھڑی تھی۔ اپنے میلے دوپٹے سے مُنہ پونچھ کر بولی۔ لکشمن نے ازتھ کیا؟ رام چندر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جو سرد آہیں بھرتے تھے اور جوش رقت سے اپنا مُنہ

اچھل پڑتے تھے۔ ہچکیاں لیتے ہوئے بولے "لکشمن کی ماں! تم جا کر اُسے جلد سمجھاؤ۔ فرمانبردار لڑکا ہے۔ تمہارا کہنا نہ ٹالیگا۔"

"تمہارا کہنا نہ ٹالیگا" سنکر پاروتی کو غرور کا نشہ محسوس ہوا اور اس نشے میں اس نے وہ دیکھ لیا۔ جو وہ نہ دیکھ سکتی تھی۔ اتراتی ہوئی اٹھی اور اٹھلاتی ہوئی مکان کے اُس حصے میں پہنچی۔ جہاں لکشمن بیٹھا اپنے دوست آیوس کے ساتھ گفتگو میں مشغول تھا۔ ماں کو آتے دیکھ کر لکشمن نے بات چیت بند کر دی اور سوال کرنیوالی نگاہوں نے نگاہوں سے سوال کیا۔ ماتا کیا حکم ہے؟"

جہاں زبان عاجز رہ جاتی ہے۔ وہاں آنسو کام آتے ہیں اور جس کام کو آنسو بھی ادھورا چھوڑ دیتے ہیں۔ اُسے نگاہ مکمل کر دیتی ہے۔ پاروتی نے پہلے آنسو بہائے اور پھر ٹھنڈی سانس لے کر نگاہ سے نگاہ ملا دی۔

لکشمن سب کچھ سمجھ گیا اور کہنے لگا "ماتا یہ ناممکن ہے!"

پاروتی نے تیکھی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور کہا ماں باپ کو سنکھیا کھلا جاؤ۔

آیوس نے سنکر کہا "فکر نہ کریں آپ کے لئے تیس روپے ماہانہ کا انتظام کر دیا گیا ہے۔"

جب آدمی کو زیادہ امید ہوتی ہے تو وہ تھوڑی رقم پر جھلا اُٹھتا ہے۔ سو ڈیڑھ سو کے خیال میں دو تین ماہ پرورش پانے کے بعد تیس روپے کی قلیل رقم حقیر معلوم ہوئی۔ اور ناک چڑھا کر اُس نے نفرت کا اظہار کیا۔

ادھر رامچندر نے سمجھا۔ آخر پاروتی عورت ہے۔ ابلا ہے۔ کمزور ہے۔ اس لئے اُسے مدد کی ضرورت ہے۔ آپ اس کی مدد کو آیا۔ اس کے ساتھ ٹھنڈی آہیں تھیں۔ اور دلدوز ہچکیاں تھیں۔ میدان میں مسلح جانا ہی ٹھیک ہے۔

مگر لکشمن کے ضبط کی سنگین دیواریں نہ ماں کے آنسوؤں سے گریں، نہ طعنوں سے نہ باپ کی ہچکیوں سے اور نہ ٹھنڈی آہوں سے وہ چٹان کی طرح کھڑا رہا۔ طوفان آیا اور گذر گیا۔ مگر

چٹان اسی طرح کھڑی رہی۔ للکشمن اپنی زندگی آریہ سماج کو دے چکا تھا اور بالکل مفت کام کرنیکا وعدہ کر چکا تھا۔ اس کے الفاظ پر بھرے جلسے میں پُر جوش تالیاں پیٹی جا چکی تھیں اور سارے شہر میں اس کا چرچا ہو رہا تھا۔ کمان سے تیر جا چکا تھا۔ اب واپس آنا ناممکن تھا۔

ماں باپ۔ کڑھے۔ ہم نے پیتل کو سونا۔ اور پتھر کو لال سمجھ لیا تھا۔ مگر آخر پیتل پیتل ہے۔ اور سونا سونا۔ پتھر پتھر ہے اور لال لال ان کو بدل کون سکتا ہے!

(۲)

للکشمن کا میدان میں نکلنا تھا۔ کہ چاروں طرف دھوم مچ گئی۔ اس کے لفظ لفظ سے عقیدت کا رنگ جھلکتا تھا اور فقرے فقرے سے محبت کا رس ٹپکتا تھا۔ اس کے چہرے پر جلال تھا۔ اور آنکھوں میں کشش تھی۔ وہ جب بولتا تھا۔ زبان سے پھول گرتے تھے۔ اور گرکر ہی نہ رہ جاتے تھے۔ بلکہ پھر ہوا میں اُڑتے تھے اُڑ اُڑ کر حاضرین کے دلوں پر پہنچتے تھے۔ پھول جہاں جاتے ہیں۔ [illegible] پریم اور شردھا کی برکھا کرتے ہیں۔ مگر جب یہ پھول دل سے نکلیں اور لفظوں کا جامہ پہن کر [illegible] تو پھر اُن کے اثر کا کیا کہنا۔ للکشمن کا لکچر مسلسل جادو ہوتا تھا۔ لوگ جھومتے تھے اور دیا نند کی جے کے نعرے بلند ہوتے تھے۔ جب للکشمن ایک شہر سے دوسرے شہر میں جاتا تھا۔ [illegible] ساتھ سفر کرتا تھا۔ کہ للکشمن کی زبان پر سرسوتی کا باس ہے!

(۳)

سیٹھ چھیٹن لال لاکھوں کے آدمی تھے۔ ہر شہر میں کوٹھیاں تھیں۔ اور دور دور [illegible] چلتی تھیں۔ وہ رات دن دولت میں کھیلتے تھے اور لکشمی اُن کے آگے پیچھے دوڑتی پھرتی تھی۔ وہ جب اپنے سر بفلک مکانوں کو دیکھتے۔ وہ جب اپنی بے شمار دولت کو دیکھتے۔ وہ جب اپنے بڑھتے ہوئے کاروبار کو دیکھتے تو ان کے دل پر چوٹ پہنچتی۔ مکان کس کا ہے؟ ان میں کوئی بسنے والا نہیں تھا!

وہ چاہتے تھے۔ آہ کسقدر چاہتے تھے۔ کہ اُن کی گود میں بیٹھ کر اُن کی داڑھی۔ اور مونچھوں

کو چھیڑنے والی ننھی سی کوئی ہستی، چھوٹا سا کوئی کھلونا ملے۔ کوئی وجود ہو جو اُن کی بیٹھک کو خراب کرے جو اُن کے میز کے ضروری کاغذات کو پھاڑ دے۔ اُن کے انتظام کو درہم برہم کر دے۔ وہ کام کاج سے تھک ٹوٹ کر جب روٹی کھانے لگیں۔ تو انہیں روٹی نہ کھانے دے۔ جب رات کو سونے لگیں۔ تو رو رو کر اُن کی نیند کو خراب کرے وہ ایسے وجود کے متمنی تھے۔ جو اُن کے ضروری کاموں میں ہر رج ڈالے ضدوں سے اُنہیں ستائے اور ہٹ کر کے اُنہیں غصہ چڑھائے اولاد ایک قبر ہے جس میں والدین زندہ دفن ہو جاتے ہیں۔ دن گذرتے جاتے تھے اور سیٹھ کی دلی آرزو۔ دیرینہ خواہش بر آنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی!

چاند کو دیکھ کر جو خوشی چکور کو ہوتی ہے۔ پھول کو دیکھ کر جو خوشی بلبل کو ہوتی ہے۔ وُہی خوشی لکشمن کو دیکھ کر سیٹھ چھبٹن لال کو ہوئی۔ جب لکشمن سامنے آیا۔ تو شکل دل میں کھب گئی آواز سنی اور کان میں گونجنے لگی۔ ایک خیال تھا۔ جو دماغ میں چکر لگانے لگا۔ ایک تجویز تھی جو سوتے جاگتے آنکھ کے آگے ناچنے لگی ایک خوشی تھی۔ جو اس کے آگے آگے بھاگ رہی تھی۔ اور وہ اُس کے تعاقب میں پیچھے پیچھے دوڑ رہے تھے اب سیٹھ چھبٹن لال کی آرزو یہ تھی۔ کہ لکشمن مجھے اپنا سمجھے اور میں اسے اپنا فرزند تصور کروں۔ اُسے پیار سے پکڑ کر چوم سکوں اور وہ ادب سے سر جھکا کر میرے سامنے کھڑا ہے میں بھول جاؤں اور میرا دماغ سمجھ کہ یہی ہے۔ جو میرا حقیقی فرزند ہے اور جس نے میری بیویوں کی چھاتیوں کو چھوا ہے۔

اس خیال کو دل میں، اور ان الفاظ کو لبوں پر لئے ہوئے سیٹھ چھبٹن لال۔ نے لکشمن سے ملاقات کی اور اوّل ہی ملاقات میں اپنا دل کھول کر اُسے دکھا دیا۔ لکشمن کو روپے کا خیال نہ تھا۔ قدر و منزلت کا خیال نہ تھا۔ مگر دل کا خیال تھا۔ اور اُسے صدمہ نہ پہنچانے کا خیال تھا۔ اس خیال سے، اور محض اس خیال سے لکشمن نے سیٹھ کی آرزو کے آگے۔ سر جھکا دیا۔ سیٹھ نے وفورِ محبت سے اُسے بغلگیر کر لیا۔ اور آنسوؤں کے ساتھ منہ چوم لیا۔ ماں باپ نے سُنا اور غرور سے گردن ہلائی۔ بیٹا لائق ہی تو ہے۔ ورنہ اتنی عزت کا ہے کو ہوتی اور اتنی دولت کا ہے کو دوڑی ہوئی آتی مگر اس دولت

کی لکشمن کو کوئی خوشی نہ تھی۔

۱۴

ایک ماہ کے بعد اخبارات میں یہ خبر نکل گئی۔ کہ مسٹر لکشمن کی شادی ہرلشچندر بیرسٹر کی تعلیم یافتہ دختر سے ہو گئی ہے اور ساتھ ہی یہ نوٹ نکلا کہ آئندہ سے خاوند بیوی دونوں پرچار کا کام زیادہ جوش، زیادہ لگن، اور زیادہ سرگرمی کے ساتھ کرینگے۔

لکشمن نے اُسی طرح کام کو جاری رکھا۔ اور اُس کی عورت نے اس کے ساتھ کام کرنا شروع کر دیا۔ اب جہاں جہاں وہ جاتے تھے۔ اُن کی اور بھی عزت ہوتی تھی۔ دونوں امیر ہیں۔ لاکھوں روپے بینکوں میں جمع ہیں۔ مگر دھرم کا خیال دل میں جاگزین ہے۔ اس لئے سفر کرتے ہیں تکلیفیں اُٹھاتے ہیں۔ خاوند آدمیوں میں پرچار کرتا ہے بیوی عورتوں پر خیالات کی بارش کرتی ہے۔ کوئی معمولی بات ہے۔ دھن ہیں وہ مائیں جو ایسی اولاد پیدا کرتی ہیں۔

ایک دن دونوں بیٹھے تھے لکشمن اپنشدوں کا پاٹھ کر رہا تھا۔ اور عورت بیٹھی سُن رہی تھی موقع موقع پر اعتراض کرتی تھی۔ اور لکشمن محبت سے اُنکا جواب دیکر اُسکی شانتی کر دیتا تھا اتنے میں چٹھی رساں آیا۔ اور ٹریبون پھینک گیا اپنشدوں کا پاٹھ ختم کرکے لکشمن نے اُسے کھولا۔ اور کہنے لگا "دیوی تمہارے گھر ڈاکہ پڑ گیا۔ اور پتا قتل ہو گیا"

عورت کا رنگ اُڑ گیا اور اُس نے کہا "کیا کہا ہے؟"

لکشمن نے اخبار کی طرف دیکھ کر کہا "تمہارے گھر ڈاکہ پڑ گیا۔ اور تمہارا پتا قتل کر دیا گیا"

عورت بیہوش ہو گئی اور زمین پر گر گئی لکشمن شانتی سے کھڑا رہا پھر بیٹھا۔ اور اُس کا سر اپنے زانو پر رکھ کر اُس کے چہرے پہ پانی کے چھینٹے دئے۔

اُس نے آنکھیں کھول کر کہا "یہ کیا انرتھ ہے؟"

لکشمن نے کہا "جو کچھ ہو گیا سو ہو گیا۔ اب رونے یا چلانے سے تمہارے پتا زندہ نہیں ہو سکتے"

سرلا نے کہا "ہاں آپ کا دل کہاں سے لاؤں۔ لوگ کہتے ہیں۔ وہ لوہے کا ہے۔"

(۵)

لیکچر ہو رہا تھا۔ اور الفاظ دلوں میں اتر رہے تھے۔ یہ تقریر نہیں تھی۔ آگ کے شعلے تھے۔ جو بھڑک رہے تھے۔ مضمون مستقل مزاجی تھا۔ اور اس خوبی سے لکشمن نے نبھایا کہ لوگ عش عش کر اُٹھے

لیکچر ختم ہُوا۔ اور تار والے نے آکر تار لکشمن کے ہاتھ میں رکھ دی۔ دستخط کر کے تار کھولی اور پڑھ کر جیب میں رکھ لی۔

سکرٹری نے پوچھا "خیر تو ہے؟"

لکشمن نے کہا "جی ہاں۔ کوئی فکر والی بات نہیں ہے۔"

ڈیرے کو جاتے وقت سرلا نے کہا "تار کیسی ہے؟"

لکشمن نے جواب دیا "پتاجی کا انتقال ہو گیا ہے۔ سنسکار آدمی سب آپوں نے کروا دیا ہے۔ رات کی ٹرین سے ہمیں گھر چلنا ہوگا۔"

سرلا نے لکشمن کے چہرے کو دیکھا۔ وہاں کوئی تبدیلی نہ تھی۔ اُس نے حیرانی سے کہا "آپکو کوئی رنج نہ ہوا؟"

لکشمن نے مسکرا کر جواب دیا "میرا آج کا لیکچر تم سُن چکی ہو۔"

سرلا خاموش رہ گئی۔

ڈیرے پر جا کر دوسری تار ملی سیٹھ چھیشی جی کا دیوالا نکل گیا۔ اور لکشمن کو مفلس قلاش بنا گیا۔ چہرے کا رنگ اب بھی ویسا ہی تھا۔

سرلا نے کہا "اب رہنے کو بھی مکان نہ رہا۔"

لکشمن نے جواب دیا "دنیا بہت خالی پڑی ہے۔"

سرلا نے یہ استقلال دیکھ کر کلیجہ تھام لیا۔

(۲)

لکشمن کی محبوبہ بیوی، نازک اندام سرلا موت کا کھلونا بنی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر مایوس ہو رہے تھے اور اسکی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر نے باریک بینی سے معائنہ کیا۔ اور باہر آکر کہا۔ "یہ نہیں بچ سکیں۔ ان کا آج ہی انتقال ہو جائیگا"

لکشمن کو سرلا سے انتہائی درجہ کی محبت تھی۔ وہ تعلیمیافتہ اور سمجھدار تھی خاوند کی فرمانبردار تھی۔ اور اسکے اشارے پر چلتی تھی۔ اس کا دل محبت سے بھرا ہوا تھا۔ اور وہ محبت کے سوا کچھ نہ تھی۔ لکشمن کہا کرتا تھا میرا دل تاریک کوٹھڑی ہے جسمیں سرلا چراغ بنکر چمک رہی ہے اور مجھ پر مسرت کی برکھا کر رہی ہے۔ اس کی موت کی خبر سنکر اُسے صدمہ پہنچا۔ مگر وہ سنبھل کر اندر گیا اور سرلا کے سرہانے جھک کر اُس کی طرف دیکھا اور کہنے لگا "پریا جی! کیا حال ہے؟"

سرلا نے لکشمن کے ہاتھ پکڑ لئے اور کہا "میرے پاس بیٹھ جائیے"

لکشمن چُپ چاپ بیٹھ گیا۔

سرلا نے کہا "پران ناتھ! آخری وقت نزدیک ہے اور موت میرے پاس آ رہی ہے۔ آپ مجھے حوصلہ نہ دیں۔ میں ڈاکٹر کے الفاظ سُن چکی ہوں۔ صبح کی پہلی کرن مجھے مردہ دیکھیگی۔ میری آنکھیں ہونگی۔ مگر دیکھ نہ سکینگی۔ کان ہونگے مگر سُن نہ سکینگے۔ ناک ہو گا سونگھ نہ سکیگا۔ چڑیا اُڑ جائیگی اور پنجرا خالی رہ جائیگا"

لکشمن نے کہا "نہیں نہیں ڈاکٹر پرماتما نہیں ہے۔ لوگ مرت کے کنارے سے واپس آتے دیکھے گئے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ تم بچ جاؤ"

سرلا نے اپنے کمزور ہاتھ لکشمن کی گردن کے گرد حمائل کر دیئے۔ اور نیلے ہونٹ ہونٹوں سے لگا دیئے۔ لکشمن نے مرنیوالی تصویر کو پیار کیا۔ نہ خاوند الگ ہوتا تھا۔ نہ بیوی الگ ہوتی تھی۔ وہ ایک دوسرے کو پیار کرتے رہے۔ اور دیر تک کرتے رہے

لکشمن سمجھ رہا تھا کہ بیوی ہاتھ سے جا رہی ہے اور پھر دوبارہ نہ ملیگی۔ بیوی سمجھتی تھی مر رہی ہوں۔ پھر دوبارہ نہ دیکھوں گی۔ وہ گرمجوشی سے ایک دوسرے کو پیار کر رہے تھے۔ اور موت کا بیرحم جمدوت کھڑا انتظار کر رہا تھا۔ لکشمن اُس سے الگ ہوا اور جمدوت اپنا

کام کر گیا۔ نقاہت نے بیہوش کر دیا۔ پانی ڈالنے سے ہوش آئی۔ تو محبت کی نگاہوں سے لکشمن کی طرف دیکھتے ہوئے سرلانے ہچکی لی۔ اور ہاتھ پاؤں مار کر ٹھنڈی ہو گئی۔

لکشمن نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اور باہر آگیا۔ آسن پر بیٹھ کر سندھیا کرنے لگا۔ اتنے میں سکریٹری سماج سامنے آکر بیٹھ گیا۔ اس نے دیکھا کہ چہرے پر ایک تیج ہے اور پرکاش ہے۔ سندھیا ختم ہوئی اور پرارتھنا شروع کی۔ اخیر میں کہا "پرماتما میری نہیں تیری اچھیا پورن ہو"

سیکریٹری نے پوچھا "کیا حال ہے؟"

لکشمن نے جواب دیا "وہ او رجھا سب بیکار ہے"

سکریٹری ہکا بکا رہ گیا۔ وہ جانتا تھا۔ کہ خاوند بیوی میں کتنی محبت ہے۔ مگر پھر بھی لکشمن حوصلے سے بیٹھا تھا۔ یہ دیکھ کر اس نے کہا "آپ کا دل سچ مچ لوہے کا دل ہے"

دوسرے دن لکشمن کا لکچر ہوا جس کا مضمون تھا لوہے کا دل۔

لیکچر سن کر لوگوں نے کہا۔ سچ مچ اس آدمی کی چھاتی میں ہے لوہے کا دل۔

اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی۔ تو اسکا ہیڈنگ تھا۔ لوہے کا دل۔

صلۂ نیکی

رات سرد اور تاریک تھی۔ کوئی بارہ بجے کا عمل ہو گا جب پڑھتے پڑھتے طبیعت اُکتا گئی اور میں نے کمبل سمبھال کر نوکر کو آواز دی "شمبھو"!

شمبھو آنکھیں ملتا ہوا آیا اور لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے بولا۔

"پانی چاہئیے"؟

"نہیں۔ فُل بُوٹ لاؤ"۔

"اسوقت؟"

"ہاں اسوقت"!

"کیوں؟"

"ذرا گھوم آنیکا ارادہ ہے زیادتی مطالعہ کی وجہ سے طبیعت پریشان ہو رہی ہے تاکہ سر کو سرد ہوا لگے گی۔ نیند آنا دُشوار ہے"!

شمبھو ہمارا خاندانی ملازم تھا۔ بہت وفادار، بہت نیک طبیعت والدین کی وفات کے بعد وہ ہی میری خبر گیری کیا تھا۔ اور حد سے زیادہ محتاط رہا کرتا تھا۔ رات کیوقت مجھے تنہا باہر جاتا دیکھ کر اُسے خوف سا معلوم ہُوا۔ مگر چُپ چاپ ساتھ کے کمرے سے فُل بُوٹ لاکر پہنانے لگا، میں نے کہا۔

"میں جلد لوٹ آؤں گا"!

بظاہر اس سے اُس کی تشفی نہیں ہوئی میری طرف دیکھ کر بولا۔

"میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔ رات کا وقت ہے۔ تنہا باہر نکلنا خالی از خطرہ نہیں"!

میں نے کہا "تم خوف کیوں کرتے ہو۔ جانتے نہیں میں رات کے وقت باہر گھومنے کا عادی ہوں"
تسمہ باندھتے باندھتے شمبھو نے ایک دفعہ پھر میری طرف دیکھ کر کہا "یہ تو درست ہے مگر آج رات بہت جا چکی ہے"

"کوئی پرواہ نہیں میں بہت جلد قریباً ایک گھنٹے میں لوٹ آؤں گا۔ تم اسی کمرے میں لیٹو۔ میرے واپس آنے پر اپنے کمرے میں چلے جانا"

شمبھو نے سر جھکا کر جواب دیا "بہت بہتر"

میں نے ڈنڈا ہاتھ میں لے کر دروازہ کھولا۔ اور باہر نکل آیا۔ چاروں طرف قبر ایسا سکوت عالم تھا۔ اور چپے چپے سے وحشت انگیز خاموشی برس رہی تھی۔

میں خلقتاً نڈر تھا۔ لہذا بے خوفی سے سڑک پر گھومنے لگا۔ لیمپ کے سامنے پڑھنے کی وجہ کر دماغ میں سوزش سی پیدا ہو چلی تھی۔ سرد ہوا کے لگنے سے ایسا معلوم ہوا گویا کسی نے سر پر برف کی ڈلی رکھ دی ہے۔

سڑک کے دونوں کناروں پر لیمپوں کی قطار بہت دلفریب معلوم ہوتی تھی۔ میں ٹکٹکی باندھ کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔ اور سوچنے لگا۔ کہ اگر تاریک رات میں روشنی نہ ہو۔ تو رات کیسی بھیانک ہو جائے۔ اتنے میں میں نے سنا۔ کوئی منت آمیز لہجے میں کہہ رہا ہے۔ "بابو!"

میں نے لیمپوں سے نگاہ ہٹالی اور جس سمت سے آواز آئی تھی۔ ادھر کا رخ کیا۔ گھاس پر ایک ننھی پانچ چھ سالہ بچی بیٹھی ہوئی سردی سے کانپ رہی تھی۔ اور میری طرف دیکھ دیکھ کر کہہ رہی تھی "بابو!"

میں نے اسے اٹھا کر کمبل میں ڈھانپ لیا۔ لڑکی نے اپنا سر میرے کندھے پر رکھ دیا۔ اور رونے لگی۔ میں نے اسے پیار کیا اور پوچھا۔

"تمہیں بہت سردی لگ رہی تھی؟"

لڑکی نے کہا "ہاں"

اور یہ کہہ کر وہ بزور میری چھاتی سے چمٹ گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُسے خیال ہے کہ میں اُسے چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ میں نے اُسے پھر پیار کیا۔ اور یقین دلایا کہ "میں تمہیں یہاں چھوڑ کر نہیں چلا جاؤں گا۔ یہ سُنکر اُسے اطمینان ہؤا۔ اور وہ میرے منہ سے مُنہ لاکر بولی۔

"اچھا"

یہ لڑکی شکل وصورت اور لباس سے کسی امیر گھرانے کی معلوم ہوتی تھی۔ اس کے بال سُنہرے تھے۔ آنکھیں موٹی موٹی تھیں اور گول گورا چہرہ ۔ اُسکے بالوں میں ریشمی فیتہ بندھا ہؤا تھا۔ اور پاؤں میں خوبصورت چھوٹا سا ربڑ کا کالا بوٹ پڑا ہؤا تھا۔ ہاتھوں میں ہاتھی دانت کی سپید چوڑیاں تھیں۔ اور گلے کے گرد ہلکے رنگ کا گلابی مفلر لپٹا ہؤا تھا۔ میں نے سوچا کہ اسے کسی پولیسمین کے سپرد کردوں۔ تو وہ اُسے اُس کے گھر پہنچا دے گا۔ مگر جب یہ خیال میں نے ننھی سی حسینہ پر ظاہر کیا۔ تو وہ خوف سے کانپنے لگی۔ اور کہنے لگی۔

"نہ مجھے سپاہی سے ڈر آتا ہے۔ ماں کہا کرتی ہے کہ وہ مارنے والے ہوتے ہیں"

"میں نے کہا" وہ تجھے گھر پہنچا دیگا"

"نہیں وہ مجھے مارے گا"

"کون کہتا ہے؟"

"ماں کہتی ہے"

میں چُپ ہو گیا۔ والدین بچّوں کو ڈرانے کے لئے سپاہیوں کی بہت مدد لیا کرتے ہیں۔ اسی لئے لڑکی سپاہی کا نام سُنتے ہی ڈر گئی تھی۔

میں نے کہا۔ تمہارا گھر کہاں ہے؟"

لڑکی ایک لمحہ کے لئے میری طرف دیکھتی رہی۔ اور پھر آہستہ سے بولی۔ "سڑک پر"۔

"اُس کا نام کیا ہے؟"

"مجھے نہیں آتا"

"تمہارے باپ کا نام کیا ہے؟"

"مجھے نہیں آتا۔"

"وہ کہاں رہتا ہے؟"

"دفتر۔"

میں خاموش ہو گیا۔ لڑکی نے اپنا سر پھر میرے کندھے پر رکھ دیا۔ اور آہستہ آہستہ میرے منھ پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ سو گئی۔

میں نے سوچا کہ اسے اپنے گھر لے چلنا مناسب ہوگا۔ صبح اُٹھ کر اُسکے گھر کی تلاش کرنا نسبتاً آسان ہوگا۔ یہ سوچ کر میں اپنے مکان کی طرف مڑا شمبھو ابھی تک جاگ رہا تھا۔ میں نے ساری بات اُسے سُنا کر "اسے آرام سے سُلاؤ۔ صبح کو اسکا گھر ڈھونڈینگے۔"

شمبھو نے کہا "اچھا"

(۲)

صبح کو میں بہت دیر سے واپس آیا۔ لڑکی میز پر بیٹھی ہوئی۔ میرا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی کود کر میز سے نیچے اُتر آئی۔ اور دوڑ کر میری ٹانگوں سے چمٹ کر بولی۔

"مجھے بڑی بھوک لگی ہوئی ہے"

میں نے اُسے اُٹھا کر گلے سے لگا لیا۔ اور کہا "تم نے روٹی کھائی نہیں؟"

"نہیں میں اپنے باوجی کے ساتھ کھایا کرتی ہوں۔ آج تمہارے ساتھ کھاؤں گی"

میں نے دیکھا لڑکی عمر کی نسبت سمجھدار زیادہ ہے۔ اُس نے اپنی انگلی منھ میں ڈال لی۔ اور کھیلنے لگی۔

شمبھو نے کھانا سامنے رکھ دیا اور میں ننھی حسینہ کو گود میں بٹھا کر بڑے مزے سے کھانے میں مشغول ہوا۔ یکایک لڑکی نے اُٹھ کر میری ٹوپی پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

یہ سوال اس سے بہت دیر پیشتر مجھے کرنا چاہئیے تھا۔ اِس لئے میں بہت نادم ہوا۔

میں نے کہا "تم بتاؤ۔"

لڑکی نے سنجیدہ شکل بنا کر اور منہ پھلا کر جواب دیا "میرا نام برج بالا دیوی ہے۔"

"برج بالا دیوی یا برج بالا؟"

"برج بالا نہیں۔ برج بالا دیوی کہو۔ ماں کہتی تھی۔ تمہیں کوئی برج بالا کہے۔ تو وہ بولا کرو برج بالا دیوی کہے۔ تب بولا کرو۔ دیبو بھی مجھے برج بالا دیوی کہا کرتا ہے۔"

میں سمجھ گیا دیبو اس کا بھائی ہوگا۔ تاہم وہ سوال کرنا میں نے ضروری سمجھا۔

"دیبو کون ہے؟"

لڑکی میری طرف دیکھتے دیکھتے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اور پھر کہنے لگی "تمہیں نہیں پتہ وہ میرا بھائی ہے۔ اُسے ابھی بولنا نہیں آتا۔ وہ روٹی کو لوتی کہا کرتا ہے۔"

اسوقت تک کھانا ختم ہو چکا تھا۔ اور شمبھو میرے ہاتھ دھلا رہا تھا۔

میں نے کہا "اپنے گھر جاؤ گی؟"

لڑکی اُچھل پڑی اور خوشی سے کہنے لگی "ہاں چلوں گی۔"

میں نے گھر سے باہر نکلنے کو چک اُٹھائی۔ بابو رامچندر جی سے مجھے ضروری کام تھا۔ اس لئے میں نے پہلے اُدھر سے فارغ ہونے کا ارادہ کیا۔ لڑکی نے سمجھا۔ میں اُس کے گھر جا رہا ہوں۔ اس لئے اُس نے مجھے ہاتھ سے ٹھیرنے کا اشارہ کیا۔ اور بڑی دلفریب ادا سے ہاتھ دھونے لگی۔

ہاتھ دھو کر وہ میرے پاس آگئی۔ اور رومال سے منہ پونچھ کر بولی "چلو۔"

میں نے کہا "تم ٹھہرو۔ میں گاڑی لے آؤں۔ گاڑی میں چڑھ کر چلینگے۔"

لڑکی کہا "اچھا مگر جلدی آنا۔"

بابو رامچندر جی سے مجھے بہت مختصر کام تھا۔ اس لئے جلدی ہی میں واپس آگیا۔ اور ساتھ ہی تانگا بھی لیتا آیا۔

شمبھو نے مجھے دیکھ کر خوشی سے کہا "اس لڑکی کے مکان کا پتہ لگ گیا۔"

میں نے کہا "کیسے؟"

"اس کے فراک کے اندر سے یہ کاغذ برآمد ہوا ہے"

اور اُس نے میرے ہاتھ میں کاغذ کا ایک ٹکڑا رکھ دیا جس پر لکھا تھا"

میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ میں نے جلدی جلدی کیش بکس سے کچھ نقدی لی۔ اور لڑکی کو ساتھ لے کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔

(۳)

پتہ چونکہ مکمل اور صاف تھا۔ اس لئے زیادہ بھٹکنے کی نوبت نہ آئی دُور سے ہی لڑکی نے اپنا مکان شناخت کر لیا۔ اور خوشی سے تالیاں بجا بجا کر کہنے لگی "وہ گھر آ گیا" وہ گھر آ گیا"

یہ کہکر اُس نے انگلی سے اشارہ کر کے مکان بتلایا۔

وہ بہت شاندار کوٹھی تھی۔ جس کے چاروں طرف باغ تھا۔ میں نے الفور سمجھ گیا۔ کہ یہ کسی بیرسٹر کی کوٹھی ہے اور برج بالا اسی کی لڑکی ہے۔ ہر چند کہ میں نے برج بالا کو آرام پہنچانے کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا تھا۔ مگر اب اس کے والد کی کوٹھی دیکھ کر میرے دل میں خیال آیا۔ کہ مجھے اس کی اس سے زیادہ خاطر مدارات کرنا چاہئے تھا۔

گاڑی رک گئی۔ اور میں لڑکی کو لے کر نیچے اُترا۔ گاڑی والے کو ٹھہرنے کا اشارہ کر کے میں لڑکی کے پیچھے پیچھے چلا۔ جو میرے آگے آگے چل کر مجھے اپنے گھر کا راستہ دکھا رہی تھی۔ اور ساتھ ہی کہتی جاتی تھی۔

"اس طرف آؤ"

برامدے میں ایک عورت کھڑی تھی۔ جس کے بشرے سے گھبراہٹ اور سراسیمگی کے آثار نمایاں تھے۔ لڑکی پر نظر پڑتے ہی وہ دوڑ کر آئی۔ اور "میری بچی" "میری بچی" کہتے ہوئے اُس نے لڑکی کو اُٹھا کر گلے سے لگا لیا۔

برج بالا نے ماں کے گلے میں باہیں ڈال کر کہا "ماں میں آ گئی"
عورت چپ چاپ آنسو بہانے لگی اور اپنی خوبصورت لڑکی کا بار بار منہ چومنے لگی۔ میں یہ نظارہ دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔

برج بالا ماں کو پا کر ایک دم کے لئے مجھے بھول گئی تھی۔ یکایک وہ ماں کی گود سے نیچے اتر آئی۔ اور میری طرف اشارہ کر کے بولی "ماں رات کو میں اُس بابو کے گھر رہی تھی۔ وہ بڑا اچھا آدمی ہے"

عورت سر جھکا کر میرے نزدیک آئی۔ اور عجز سے بولی "بیٹا تمہارا شکریہ کیسے ادا کروں۔ میرا اور بال تمہارا مشکور ہے یہ جدائی کے گھنٹے ہمارے لئے بہت بے چینی کے گھنٹے تھے۔ آؤ اندر چلو وہ تم کو مل کر بہت خوش ہوں گے"

میں نے کہا "ماتا جو کچھ میں نے کیا۔ وہ میرا فرض تھا۔ اب اجازت دو۔ امتحان کے ایّام نزدیک ہیں اتوار کا دن تھا وہ تو گیا۔ اب رات کو پڑھنے کا ارادہ ہے"

اُس نے کہا "تم نیک لڑکے ہو۔ پرماتما تمہیں کامیابی دیگا۔ مگر ذرا اندر تو چلو"

میں چپ چاپ ساتھ ہو لیا۔ برج بالا ہم سے پہلے ہی اپنے والد کے پاس پہنچ چکی تھی اور اُسے آنے کی اطلاع دے چکی تھی۔ وہ سرعت سے باہر آئے اور مجھے گلے سے لگا کر بولے "تم نے ہمیں بچا لیا ہے"

میں نے آنکھیں جھکا لیں۔ اور آہستہ سے بولا "یہ تو میرا فرض تھا۔ ایسی بھولی بھالی بچی کو دیکھ کر خواہ مخواہ دل میں پیار آ جاتا ہے اور مدد کو جی چاہتا ہے"

اُس وقت خاوند نے بیوی کو کچھ اشارہ کیا۔ اور برج بالا آ کر میری ٹانگوں سے چمٹ کر بولی "بابو"

میں نے اُسے گود میں اٹھا لیا۔ اور کہا "تمہارا گھر آ گیا"

برج بالا نے کچھ دیر تک میری طرف دیکھا۔ پھر پیشانی پر کھلے ہوئے بالوں کو پیچھے ہٹایا۔

اور کہا: "گھر تو نہیں آیا۔ ہم گھر آ گئے ہیں"

یہ سن کر سب کے سب ہنس پڑے میں نے دل میں کہا۔ "لڑکی بہت سمجھدار ہے"

لال چند نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور کہا "آؤ اندر چلو"

میں انکار نہ کر سکا۔ ساتھ ساتھ ہو لیا۔ اس وقت میرے دل میں خوشی اور فخر دونوں کیجا ہوئے تھے۔ بچھڑوں کا ملاپ کرانا پرم دھرم ہے۔ اسی سے سکھ ملتا ہے اور اسی سے جیون ہوتا ہے۔ میں نے دیکھا۔ ماں باپ برج بالا کے بغیر بدحواس ہو رہے تھے۔ اور ہر چند کہ اب اُن کی لڑکی مل چکی تھی۔ تاہم اُن کی سراسیمگی اور بدحواسی میں بہت کم فرق آیا تھا۔ وہ بار بار ایک دوسرے کی سمت دیکھتے تھے اور پھر میری طرف غلط انداز نگاہ ڈال لیتے تھے۔ بہر حال میں نے اسکا چنداں خیال نہ کیا۔

اندر چل کر میری بہت خاطر تواضع کی گئی۔ اور بات چیت کرتے کرتے شام ہو گئی۔ میں نے کہا: "اب اجازت دیجئے"

"آج رات نہیں"

"کیوں"

"ہمارا جی نہیں بھرا۔ تمہیں اور دیکھنے کی خواہش ہے"

میں نے بہت اصرار کیا۔ مگر لال چند اور اُن کی بیوی نے میری ایک نہ چلنے دی۔ اور آخر مجھے رات وہیں ٹھہرنے پر رضامند کر ہی لیا۔ میں نے بھی کہا۔ چلو برج بالا کو دیکھنے کا اور موقعہ ملا۔ کھانا جو مجھے کھلایا گیا تھا۔ بہت پرتکلف تھا۔ شاید یہ تکلف اُن کے لئے نہ ہو۔ بڑے آدمی تھے۔ میں متوسط درجے کا شہری۔ میرے لئے وہ بہت تکلف کی شے تھی۔

بات چیت کرتے کرتے گیارہ بج گئے۔ میں نے کہا "نیند آئی ہے"

لال چند نے نوکر کو آواز دی اور کہا: "غسل خانے کے آگے جو تیسرا کمرہ ہے۔ اُس میں بستر و کر دو"

نوکر نے کہا: "بہت اچھا"

برج بالا ابھی ابھی تک جاگتی تھی۔ نوکر کو کہنے لگی "شنکر سفید چادر بچھانا"
لال چند ہنس پڑے اور کہنے لگے "دیکھو لڑکی صبح سے تمہاری ہی سفارش کر رہی ہے"
میں نے اس کا خیال نہ کر کے نوکر کو اشارہ کیا۔ کہ کہدو "نہیں سفید چادر نہیں ہے۔ میلی چادر بچھاؤں گا"
نوکر میری بات سمجھ گیا۔ اور بولا "برج بالا سفید چادر تو کوئی نہیں ہے میلی چادر ہی ہے وہی بچھاؤں گا"
برج بالا نے جلدی سے کہا "میری لے لو"
"وہ چھوٹی ہے"
"بابو جی کی لا دو"
بابو لال چند نے کہا "کیوں؟"
برج بالا بے صبر ہو اٹھی۔ اور باپ سے منت کر کے بولی "بابو کو سفید چادر بچھا دو"
باپ نے لڑکی کو پیار سے گود میں اٹھا لیا۔ اور منہ چوم کر بولا "اچھا"
یہ سن کر برج بالا نوکر کے ساتھ اس کمرے میں گئی۔ جہاں میرے سونے کا انتظام تھا
تھوڑی دیر بعد برج بالا ہانپتی ہوئی آئی اور کہنے لگی "وہاں ہماری نوکرانی راجی اس کمرے میں۔۔۔"
ابھی یہ بات ختم نہ ہونے پائی تھی کہ اس کی ماں نے اٹھ کر اسے پکڑ لیا۔ اور کہا "برج بالا تو بڑی شریر ہو گئی ہے۔ ابھی تک تجھے نیند نہیں آتی؟ چل آرام سے سو"
اسی وقت نوکر نے آ کر کہا "بابو جی بستر طیار ہے"

(۴)

میں سونے کے کمرے میں جا کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ اور لیٹتے ہی میری آنکھ لگ گئی۔
کوئی دو بجے کے قریب بیدار ہوا۔ تو طبیعت گھبرائی ہوئی تھی۔ میں نے باہر نکل کر ذرا سرد ہوا میں گھومنے کا ارادہ کیا۔ مگر جب باہر نکلنے لگا۔ تو معلوم ہوا کہ باہر کا دروازہ بند کیا ہوا ہے

مجھے خیال آیا۔ کہ یہ ضرور دھوکا ہے۔ اس کی تہ میں کوئی نہ کوئی خاص بات ہے!

انسانی طبیعت کا خاصہ ہے۔ کہ جب ذرا سا بھی شک پڑ جائے۔ تو معمولی معمولی واقعات بھی شک کی تائید کرنے لگ جاتے ہیں۔ مجھے بھی اب خاوند بیوی کے اشارے کرنا کوئی خاص بات معلوم ہونے لگی۔

میں کمرے میں ٹہلنے لگا۔ یکایک معلوم ہوا کہ ہوا میں کسی قسم کی بُو آرہی ہے۔ یہ کیا ہو سکتا ہے! بجلی کی روشنی تیز تھی۔ میں نے کونا کونا دیکھا۔ مگر کچھ پتہ نہ لگا۔ کھڑکیوں کے پاس جا کر دیکھا کہ کہیں باہر سے تو یہ بُو نہیں آتی۔ مگر ایسا بھی نہ تھا۔

اس کے کمرے کے ساتھ لگتا ایک اور کمرہ تھا۔ جب میں اُس دروازے کے نزدیک پہنچا تو یہ بُو زیادہ معلوم ہوئی۔ میں سمجھ گیا۔ جو کچھ ہے اس کے اندر ہی ہے۔

دروازہ بند نہ تھا۔ کھُلا تھا۔ میرے ہاتھ لگانے سے ہی کھُل گیا۔ مگر جونہی میری نظر اندر پڑی میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ وہاں ایک نوجوان عورت کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اور پاس ہی پستول پڑا تھا۔

میری آنکھوں کے آگے سے پردہ ہٹ گیا۔ اور مجھے صاف صاف معلوم ہو گیا۔ کہ میرے ساتھ دھوکا کیا گیا ہے۔ مجھے قتل کا مجرم گردانا گیا ہے۔ اور ظاہر کیا جائیگا۔ میرے دل میں رہ رہ کر سوال اُٹھنے لگا۔ کہ کیا نیکی کا یہی صلہ ہے؟

مجھے اسوقت سمجھ آئی کہ خاوند بیوی کے چہروں کا رنگ کیوں اُڑا ہوا تھا۔ وہ اشاروں میں باتیں کیوں کرتے تھے؟ اُنہوں نے رات بھر مجھے ٹھہرانے پر کیوں اصرار کیا؟ مجھے اسوقت معلوم ہوا۔ کہ برج بالا کیا کہنے آئی تھی۔ اور اس کی ماں نے اُسے اُٹھکر بہانے سے کیوں سلانا مناسب سمجھا۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ رات بھر مجھے نیند نہ آئی۔ اور صبح سویرے ہی پولیس انسپکٹر نے آکر میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈالدیں۔ اور کہا "آیئے باہر ٹانگا تیار ہے"

(۵)

مجھ پر قتل کا الزام لگایا گیا۔ اور زبردست شہادتیں پیش کی گئیں۔ لائق سرکاری وکیل نے ایسے ایسے نکتے نکالے۔ کہ میری عقل دنگ رہ گئی۔ اور مجھے یقین ہو گیا۔ کہ موت برحق ہے اور اب چھٹکارا ناممکن ہے شمبھو نے بذریعہ تار میرے چچا کو بلا بھیجا تھا۔ اور وہ آ کر بڑی سرگرمی سے میرے بچاؤ کی سعی کر رہے تھے۔ مگر حالات بدسے بدتر ہوتے گئے

آخر میری طرف سے گواہ پیش ہونے کا موقعہ آیا۔ شمبھو نے میرے وکیل کو سب کچھ بتا دیا اُس نے سب سے پہلے برج بالا کو طلب کیا۔ برج بالا کے کچہری میں داخل ہوتے ہی لالچند کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ اس وقت گواہان کے زمرہ میں تھے۔ مگر اب ایسا معلوم ہؤا کہ مجرم وہی ہیں۔

میرے وکیل نے لڑکی سے پوچھا "تمہارا نام کیا ہے؟"

"برج بالا دیوی"

"تمہارا باپ کون ہے"

برج بالا نے لال چند کی طرف اشارہ کیا۔

وکیل نے میری طرف ہاتھ اُٹھا کر پوچھا "یہ کون ہے"

برج بالا نے مجھے دیکھا۔ اور جھپٹ کر میری طرف آنا چاہا۔ اور جب اُسے روکا گیا۔ تو مجھے کہنے لگی "بابو مجھے لے لو"

وکیل نے کہا "لے لیں گے۔ پہلے میری بات کا جواب دو"

برج بالا نے بے صبری سے کہا "پوچھو"

"یہ کون ہے؟" یہ کہکر وکیل نے میری طرف اشارہ کیا۔

"یہ بابو ہے"

"یہ تمہارے گھر گیا تھا۔ تمہیں ساتھ لے کر گیا تھا؟"

"ہاں گیا تھا۔ یہ بڑا اچھا آدمی ہے"

"اچھا جب تم نے بابو کے لئے سفید چادر بچھوائی تھی۔ تو تم نے کمرے میں کیا دیکھا تھا؟"
برج بالا نے لال چند کی طرف دیکھ کر کہا "پتا جی ماریں گے"
وکیل نے کہا "کوئی نہیں مارتا۔ تم سچ سچ بتاؤ۔ پھر تم کو یہ بابو گودی میں لے لیں گے"
برج بالا نے کہا "اس کمرے میں راجی لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے اسے بلایا۔ مگر وہ نہ بولی"
"اس کے پاس بھی کچھ پڑا ہوا تھا"
"ہاں پڑا ہوا تھا"
"کیا تھا"
"کچھ تھا"
وکیل نے برج بالا کو پستول دکھا کر کہا "ایسی چیز پڑی ہوئی تھی"
"ہاں ایسی ہی تھی"
"اس وقت یہ بابو کہاں تھا؟"
"بڑے کمرے میں"
"کیا کر رہا تھا"
"باتیں کر رہا تھا"
"کس کے ساتھ باتیں کر رہا تھا؟"
"میری ماں اور باپ کے ساتھ باتیں کر رہا تھا"
وکیل نے چاروں طرف دیکھا۔ مقدمے کا رنگ پلٹ گیا تھا۔ لوگ فیصلہ کو بیتاب ہو رہے تھے۔ اور لال چند کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔
وکیل نے پھر کہا "اچھا تم نے ماں باپ سے یہ کہا تھا کہ راجی لیٹی ہوئی ہے۔ اٹھتی نہیں"
"ہاں کہا تھا"
"پھر؟"
"پھر ماں مجھے اندر لے گئی اور کہنے لگی۔ کہ کسی کو یہ کہنا نہیں"

"وکیل نے اطمینان کا سانس لیا۔ دوسرا گواہ ٹانگے والا آیا۔

"تم اس بابو کو جانتے ہو؟"

"ہاں"

"یہ کبھی تمہارے ٹانگے میں چڑھا تھا؟"

"ہاں پچھلے اتوار کو"

"کس وقت؟"

"دس بجے کے قریب"

"اس کے ساتھ بھی کوئی تھا؟"

"ہاں ایک لڑکی تھی"

(برج بالا کو دکھا کر) وکیل نے کہا "کیا وہ لڑکی یہی تھی؟"

ٹانگے والے نے لڑکی کو پہچان کر جواب دیا "میرا خیال پڑتا ہے۔ یہی تھی۔ ٹھیک ٹھیک نہیں کہہ سکتا"

یہ کہکر وکیل نے عدالت کو مخاطب کر کے کہا۔ کہ "یہ بابو اتوار کو صبح لال چند کے مکان پر گیا ہے حالانکہ ڈاکٹری معائنہ بتلاتا ہے کہ موت سنیچر کی رات کو ہوئی ہے"

اس کے بعد اور شہادتیں پیش ہوئیں۔ اور پندرہ دن کے بعد مجھے رہائی نصیب ہوئی۔ باہر آکر مجھے معلوم ہوا کہ قاتل دراصل لال چند ہے جس نے لڑکی کے گم ہونے پر راجی سے دریافت کیا کہ لڑکی کہاں ہے۔ جب راجی نے بتلایا۔ کہ وہ کہیں ادھر ادھر ہو گئی ہے۔ اور مجھے اسکا صحیح علم نہیں۔ تو لال چند نے خیال کیا۔ کہ یہ راجی کی شرارت ہے۔ اس خیال سے اس نے اسے ڈرانے کے لئے پستول اٹھایا۔ مگر غلطی سے پستول چل گیا۔ اور راجی کی موت ہو گئی۔ جب خاوند بیوی حیران تھے۔ کہ کیا کیا جائے۔ تو میں وہاں پہنچا۔ میری نیکی کو تو وہ بھول گئے۔ اُلٹا مجھے پھانسنے کی سوجھ گئی۔ اور

میں پھنس گیا۔ مگر معصوم برج بالا نے میری نیکی کا صلہ دیا۔ اور مجھے پھانسی کے تختے سے اُتروا لیا۔ چند دن کے بعد میں نے امرت بازار پتر کا میں لال چند کے متعلق پڑھا۔ کہ اُسے دس سال قید کی سزا ہو گئی ہے۔



غریب کی آہ!

کونسی بات تھی؟ جو اُس نے نہ کی۔ فقیروں کی خاطر و مدارات اُس نے کی۔ قبروں پر وہ گیا۔ شمشانوں میں دھونی اُس نے رمائی۔ جادو کا پانی اُس نے پیا۔ تعویذ گنڈے اُس نے بنوائے۔ براہمنوں کے قدموں میں وہ بیٹھا۔ تلسی ٹھاکر کا بیاہ اس نے کروایا۔ برت اُسے رکھنے والے اس نے کئے۔ سورج اُس نے پوجا جگراتے اُس نے کئے۔ دیوتا اُس نے منائے۔ منتیں اُس نے مانیں۔ قربانیاں دیں۔ خیراتیں کیں۔ مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ نہ ہی دل کی کلی کھلی۔ اور نہ ہی مراد بر آئی۔ ایک چھوڑ تین شادیاں کیں۔ روپیہ پانی کی طرح بہایا۔ مگر گوہر مقصود ہاتھ نہ آنا تھا۔ نہ آیا۔ اپنی تمام کوششوں میں سخت جدوجہد کے بعد، ہار کر پران ناتھ نے کوشش چھوڑ دی۔ دیوی دیوتاؤں کا دشمن بنا۔ اور انہیں بے نقط سنانے لگا۔

اتفاق سے جب اُس نے دیوی دیوتاؤں کی پوجا چھوڑی۔ مہاتما سادھو لوگوں کا تیاگ کر دیا۔ دو ماہ کے بعد ہی اُس کی بیوی نے اُسے مسکراتے مسکراتے خوشخبری دی۔ کہ تھوڑی ہی دیر کے بعد میں آپ کو وہ چیز دونگی۔ جو دنیا میں سب سے بیش قیمت شے ہے۔ پران ناتھ نے یہ سُنا اور اچھل پڑا۔ امید کی سرزمین اُسے نزدیک دکھائی دی جس میں اُس نے ایک خوبصورت چھوٹا سا بھولا بھالا بچّہ پنگوڑے میں لیٹا ہوا دیکھا۔ اُس کے کانوں نے ننھے بچے کے "رونے" کی دلکش اور خوشگوار آواز سُنی۔ خوشی کے باجوں کا شور سنا۔ اور "مبارک ہو مبارک ہو" کے نعرے سُنے۔ وہ مسرّت سے پھول گیا۔ اور جو قمیص پہلے بدن پر فٹ آتی تھی۔ رات کو تنگ ہونے کے سبب سے اُتاری گئی۔

اُسی رات سارے محلے کے رہنے والوں کو دعوت دی گئی اور خوشی کے تمام لوازمات بہم پہنچائے گئے۔ ہارمونیم ستار۔ گراموفون منگوائے گئے۔ گو بعض اصحاب منع کرتے رہے۔ مگر پران ناتھ کسی کی سُننے والے تھوڑے ہی تھے۔ اُنہوں نے لال پانی بھی منگوایا۔ اور رنڈی کا ناچ بھی کرا بازی گر بھی آئے۔ اور بھانڈوں نے بھی نقل اُتاری۔ نقل اس غضب کی تھی۔ کہ سنجیدہ سے سنجیدہ

آدمی بھی ہنسی سے دوہرے ہو ہو گئے۔ اور پکار اٹھے "خدا کے لئے۔ پرماتما کے لئے نہیں تو کسی بڑے کے لئے ہی سہی نقل کو ختم کرو پیٹ میں درد ہو رہی ہے۔ کہیں دم نہ نکلوا دینا!"

مگر پران ناتھ مدہوش ہو رہا تھا۔ اُس نے مونچھوں پر تاؤ دیا۔ اور بھانڈوں کو اشارہ کیا۔ "ان کو اچھی طرح سے خوش کرو نہ!" اتنے میں باہر سے شور کی آواز آئی۔ کھانا پینا چھوڑ کر لوگ اُدھر متوجہ ہوئے

(۲)

"چور! چور!! چور!!! پکڑو۔ پہنچو، جانے نہ دو" یہ آواز تھی جسے سُنکر سب کے سب اُٹھ کر باہر کی طرف دوڑے۔ پران ناتھ بھی اُٹھا اور باہر نکلا ساتھ کے مکان پہ ایک غریب لڑکا چلا چلا کر یہ الفاظ دہرا رہا تھا۔ لوگ سوٹے سنبھال کر بہادری سے، مگر ڈرتے ڈرتے، تن کر، مگر کانپتے کانپتے مکان میں داخل ہوئے۔ اور لڑکے کے پاس جا کر پوچھنے لگے "چور کہاں ہے؟ کدھر ہے؟ کچھ نقصان تو نہیں ہوا؟ چور کہیں اندر ہی تو نہیں چھپا ہوا؟"

لڑکے نے جب اتنے مددگار دیکھے۔ تو پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگا۔ لوگوں نے دِلاسا دیا اور رونے کی وجہ پوچھی۔

ہچکی بندھی ہوئی تھی۔ گلا سُوکھ رہا تھا۔ ڈرا ہُوا تھا، سہما ہُوا تھا۔ جب ذرا سنبھلا تو اُٹھ کر ایک تاریک کوٹھڑی کی طرف چلا۔ اور لوگوں کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ لوگ کوٹھڑی میں پہنچے اور لڑکے نے دیا روشن کیا۔ تو سامنے بوڑھی عورت پڑی دم توڑ رہی تھی اس کا سر پھٹا ہُوا تھا بدن زخمی تھا۔ منہ پر مُردنی چھائی ہوئی تھی۔ اور آنکھوں کی پتلیاں پتھرا ہوئی تھیں۔

لڑکا یہ دیکھ کر گھبرایا۔ اور ماں ماں کہہ کر رونے لگا۔ بچے کی آواز سُن کر جاں بلب عورت نے آنکھیں کھول دیں۔ اور کہا "بال! کیوں روتا ہے؟"

بال نے یہ سُن کر جواب دیا "تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

بوڑھی عورت نے آہستہ سے کہا "سیٹھ پران ناتھ کو بلا لاؤ"

سیٹھ پران ناتھ جلدی سے آگے بڑھا۔ اور کہنے لگا۔

امبا! دیکھو میں یہاں ہوں۔ تم کیسی ہو؟"

امبا نے اپنی کمزور، اور پتھرائی ہوئی آنکھیں اوپر اٹھا کر سیٹھ پران ناتھ کو دیکھا۔ اور کہا۔"باقی سب لوگ باہر چلے جاؤ۔ بال! تو میرے پاس بیٹھ جا۔ اور سیٹھ جی کو چارپائی بچھا دے"

لوگ جاں بلب عورت کو دیکھ کر پہلے ہی گھبرائے ہوئے تھے۔ یہ سن کر جلدی سے باہر نکل گئے۔ اور مکان میں چند لمحوں کے بعد ہی سناٹا چھا گیا۔

امبا نے رُک رُک کر کہا" سیٹھ جی! جب میرا خاوند مرا تھا۔ میں امیر تھی۔ مگر بال کے لئے، اپنے کلیجے کے ٹکڑے کے لئے، اس نور نظر کے لئے میں نے فاقے کئے۔ بھوکوں مری، پھٹے پرانے کپڑے پہنے، اور مفلسانہ زندگی بسر کی۔ اگر میں چاہتی۔ تو امیرانہ شان قائم رکھ سکتی تھی۔ مگر میں نے نہ چاہا۔ کہ اپنی خوشی پر اپنے بچے کی زندگی کو قربان کروں میرے پاس ۴۰۰ تولہ سونا اس وقت تھا۔ مگر میں نے اُسے اندر چھپا چھوڑا، دبا چھوڑا، اور پتہ نہ لگنے دیا، ظاہر نہ ہونے دیا۔ کہ میرے پاس بھی کچھ ہے"

سیٹھ پران ناتھ نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا" افسوس تو وہ روپیہ ضائع گیا؟"

امبا کی زبان خشک ہونے لگی۔ اس نے بال کو اشارہ کیا جس نے اُٹھ کر اُس کے منہ میں پانی ٹپکایا۔ اور اس نے پھر کہنا شروع کیا۔

"نہیں۔ نہیں سونا ابھی تک محفوظ ہے۔ وہ میرے لاڈلے بچے کے کام آئیگا۔ ظالم چوروں نے مجھے مارا، ڈرایا، دھمکایا مگر میں نے کہا میرے پاس کچھ ہے نہیں۔ ب... ب... بال.... پ.... پ.... پانی.... ل.... ل.... لا.... لاؤ"

بال نے پھر پانی کی بوندیں اس کے منہ میں ٹپکائیں اور اس نے پھر کہنا شروع کیا۔

"سیٹھ جی! میں مر رہی ہوں۔ میں ضرور مر جاؤں گی۔ میرا لاڈلا بچہ، میرا نازوں کا پالا بال یتیم ہو جائیگا۔ اکیلا رہ جائیگا۔ اس کے سر پر کوئی نہیں ہوگا۔ یہ فکر ہے جو میری جان نہیں نکلنے دیتا

آپ میری سہائتا کریں۔ اس ننھے کے سر پر ہاتھ رکھیں۔ پرماتما آپ کا بھلا کرے گا۔"

پران ناتھ نے کچھ سوچا اور اُٹھ کر لڑکے کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

امبانے اطمینان کا سانس لیا۔ اور کہا "چھت میں، چھت میں، عین درمیان ایک صندوقچی ہے اس میں سب زیور ہے۔"

جب زیور نکالا جاچکا۔ امبا نے کہا۔ اسے آپ ساتھ ہی لے جائیں۔ آرام سے سوئیگا۔ یہاں تکلیف ہو گی۔"

یہ کہکر بال کو پاس بلایا۔ اُسے گلے لگایا۔ اور منہ چوم کر کہا۔ بیٹا! جاؤ پرماتما پرسن رکھے۔"

یہ الفاظ اس کے آخری الفاظ تھے۔ بال کی نگاہ مردہ ماں کے منہ پر تھی۔ اور سیٹھ پران ناتھ کی زیوروں کی صندوقچی پر۔

(۳)

جوانی ایک نشہ ہے۔ اور دولت اس سے بھی تیز نشہ ہے۔ پھر جہاں دونوں کا ملاپ ہو وہاں کیا کہنا۔ یہ دونوں مل کر، زور کیساتھ، اور جوش کے ساتھ انسان کو گمراہ کرکے اُس کی آنکھوں پر پٹی اور کانوں میں پھوہے دیدیتے ہیں۔ انسان سُنتا ہے مگر نہیں سُنتا۔ دیکھتا ہے مگر نہیں دیکھتا۔ فرعون کی طرح اکڑتا ہے۔ اور ایک برساتی سیلاب میں بہتا چلا جاتا ہے۔ وُہ انسانوں کو انسان نہیں سمجھتا انہیں حیوان خیال کرتا ہے۔ اُن سے جانوروں کا سلوک کرتا ہے۔ اُنہیں ذبح کرتا ہے۔ اور آواز سُننا نہیں چاہتا۔ اس قسم کا انسان دہلی کا سیٹھ پران ناتھ ہے۔ جس کے قبضے میں دولت ہے، جوانی ہے، پندرہ سالہ لڑکا ہے۔ پران ناتھ پہلے رحمدل تھا۔ اب ظالم ہے۔ پہلے حلیم تھا، اب سنگدل ہے۔ پہلے نیک تھا۔ اب قصاب ہے، بھیڑیا ہے۔ اور صیاد ہے، وہ باز ہے، جو معصوم چڑیا کو پکڑتا ہے۔ اور کھا جاتا ہے۔ وُہ بگلا ہے۔ جو بھگت بن کر بیٹھتا ہے۔ اور موقع ملنے پر بھولی بھالی مچھلیوں کو چونچ سے دبا لیتا ہے۔

(۴)

بال کو روز تنگ کیا جاتا تھا، روز ستایا جاتا تھا۔جب اُس کا دل بھر آتا۔وہ ایک کونے میں چلا جاتا۔اور رو رو کر آنکھیں لال کر لیتا یا گھر سے باہر نکل جاتا۔اور شہر سے پرے، درختوں کے درمیان پرندوں کے پاس بیٹھ کر دل کا غبار نکالتا تھا۔وہ اپنی ماں کو یاد کرتا۔جو مرتی دفعہ اُسے پران ناتھ کے سپرد کر گئی تھی۔جس نے اقرار کیا تھا۔کہ میں تجھے بچوں کی طرح پالوں گا۔مگر اب اس سے قصابوں کا سلوک کرتا تھا۔

ایک دن تنگ آکر وہ پران ناتھ کے کمرے میں گیا۔اور سر نیچا کر کے دروازے میں کھڑا ہو گیا۔
پران ناتھ نے اُسے دیکھ کر کہا "یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟"
بال نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا "مجھے بھوشن نے مارا ہے۔یہ دیکھئے ٹانگ سے خون جاری ہے"

پران ناتھ نے حقارت سے کہا "پھر تمہاری کیا مرضی ہے؟"
بال نے کچھ جواب نہ دیا۔اور اسی طرح سر جھکائے کھڑا رہا۔
پران ناتھ نے پھر کہا "جاؤ۔اُسے بُلا لاؤ"
بال نے کہا "مجھے اس سے ڈر آتا ہے۔وہ مجھے پھر مارے گا"
پران ناتھ نے کہا "جاؤ۔سؤر دور ہو جاؤ، میری آنکھوں سے مجھے کیا کہتے ہو"
بال نے رو کر جواب دیا "مجھے اپنے گھر سے وداع کر دیجئے۔میں یہاں نہیں رہ سکتا۔میرا گذارہ یہاں محال ہے"

پران ناتھ نے اسکے چہرے کو غور سے دیکھا۔اور اسپر سادگی معصومیت، اور بچپن کی جھلک دیکھ کر کچھ دیر تک کچھ سوچتا رہا۔پھر اس کے ہونٹ پھڑکے، چہرہ تمتمایا، اور غصے سے لال پیلا ہو کر کہنے لگا "بہت بہتر، تشریف لے جائیے"
بال نے جواب دیا "پھر میرا حساب پاک کر دیجئے۔میں اب سمجھدار ہوں۔کچھ روزگار کر دوں گا"
پران ناتھ نے مسکرانے کی کوشش کی۔اور بولا۔"چہ خوش! ذات کی چھپکلی شہتیروں سے جھپٹیں"

کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ۔ پال پوس کر اتنا بڑا کیا۔ اس کا نام نہیں۔ کھلایا پلایا۔ اچھی طرح سے رکھا۔ اور اب یہ پھل ملتا ہے۔ کہ حساب پاک کرو۔ گویا میں تمہارے باپ کا قرضدار ہوں"

بال کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ بیچارہ گھبرا کر کہنے لگا "کھائے پیئے کو کاٹ کر کچھ تو مجھے دیدیں تاکہ میں اپنی زندگی گزارنے کے لئے کوئی کام کاج کر سکوں"

پران ناتھ کے غصے کا پارہ ایک سو آٹھ درجے تک پہنچ گیا۔ وہ چلا کر کہنے لگا "بدمعاش، بدکار، بیہودہ، ناہنجار، نالائق، احمق"

بال کی آنکھوں سے آنسوؤں کی ندی بہ نکلی۔ اور ہچکی بندھ گئی۔

پران ناتھ نے کہا "بس دو گھنٹے کے اندر اندر میرے مکان سے نکل جاؤ۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا"

اس رات کو ہاتھ نہ نظر آنے والی تاریکی میں، ٹھٹھرتی ہوئی سردی میں، اور گرتی ہوئی اوس میں، بارہ بجے، زبردستی دھکے دے دے کر بال کو پران ناتھ کے نوکر نے مکان سے باہر نکال کر کنڈی لگالی۔

(۵)

سنت رام "کیوں بھوشن! تم نے بھی کچھ سنا؟"

بھوشن "کیا بات ہے؟"

سنت رام "بال پاگل ہو گیا ہے۔ اور گلیوں میں روتا پھرتا ہے۔ اس کے ہونٹوں پر یہی صدا ہے۔ غریب کی آہ! غریب کی آہ!!"

بھوشن۔ (ہنسکر) "دماغ کو صدمہ پہنچا ہے"

سنت رام "وہ بیچارہ مر جائیگا"

بھوشن "شام سنگھ بھی مر ہی گیا ہے نہ"

سنت رام "یہ تو ٹھیک ہے"

"پکڑ لو۔گرفتار کرلو"

یہ آواز پولیس انسپکٹر کی تھی۔جو یکایک اندر داخل ہوا۔اور جس نے بغیر کچھ کہے کے بھوشن کو ہتھکڑی لگالی۔سنت رام گھبرایا۔اور پران ناتھ کو بمبئی میں تار دینے کے لئے بدحواسی میں دروازے بھی کھلے چھوڑ کر ڈاک خانے کی طرف بھاگا۔

ایک دن! دو دن!! تین دن!!! گذر گئے مگر سنت رام ڈاک خانے سے نہ پلٹا۔بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ایک مست سانڈھ سے ٹکرا کر مر گیا ہے۔

رات ہی رات میں پران ناتھ کا بھرا اور سجا ہوا محل خالی ہوگیا۔اس میں ٹوٹے پھوٹے مٹی کے برتنوں کے سوا کچھ نہ رہا۔چوروں نے نہیں۔محلے والوں نے پڑوسیوں نے،اپنے آدمیوں نے ہی بارہ گھنٹے میں صفائی کر دی۔مقدمہ چلا اور ایک ماہ کے بعد یہ خبر اخبارات میں نکل گئی۔

"سیٹھ پران ناتھ کے لڑکے بھوشن کو شام سنگھ طالب علم
کے قتل کے جرم میں پھانسی کی سزا دی گئی"

پران ناتھ بمبئی میں تھا۔جب اس نے یہ خبر پڑھی۔وہ تیورا کر گرا۔اور چونکہ ناقابل برداشت صدمہ تھا۔اس لئے گرتے ہی دم نکل گیا۔ہاں ابھی تک دہلی کی گلیوں میں چکر لگاتا پھرتا ہے اسکو کپڑے پھٹے ہوئے ہیں۔وہ پاگل ہے،سودائی ہے،چھوٹے چھوٹے بچے جب اسے چھیڑتے ہیں،ستاتے ہیں،وہ اُن کی طرف سنجیدگی سے دیکھتا ہے اور کہتا ہے ؎

ظالمو! خوف کرو آہ کو جانو نہ حقیر
لفظ اللہ میں ہے اسکا اثر دو بٹہ تین۔

عورت کے قابو میں

"آہ آہ! کیا کروں! یہ بات مشکل ہے، سخت مشکل ہے۔ میرے والد سب کچھ مان لینگے۔ مگر نہ نہیں مانینگے لیکن سوال یہ ہے۔ کہ شادی کس کی ہوتی ہے۔ کیا میری نہیں۔ مگر جب تک میں اُسے دیکھ نہ لوں۔ تب تک شادی نہ ہوگی، ہرگز نہ ہوگی، کہتے ہیں۔ گرہستھ کی سرزمین بڑی نظر فریب ہے وہاں ہمدردی کی لہریں اٹھتی ہیں اور خوشی کی ترنگیں پیدا ہوتی ہیں۔ درحقیقت جب آدمی سارے دن بھر کے کام سے تھکا ٹوٹا ہوا شام کو گھر جاتا ہے۔ اور اُسے ایک وجود مسکراتے ہوئے چہرے اور پھیلائے ہوئے ہاتھوں سے خوش آمدید کہتا ہے۔ اور وہ دیکھتا ہے۔ کہ وہ وجود میرے سامنے کھڑا ہے محض میرا ہے۔ جسکا سب کچھ میرا ہے جسکا دماغ میرا ہے جسکا خیال میرا ہے جس کا مال میرا ہے۔ جسکا سب کچھ میرا ہے۔ اور میرا سب کچھ جسکا ہے جو دنیا بھر میں میرا سب سے زیادہ قابل اعتبار دوست ہے۔ جس کی تصویر میرے دل میں ہے۔ اور جس کے دل میں میرا تصور ہے جو میرے خوش ہونے سے خوش، اور میرے اوداس ہو جانے سے تڑپنے لگ جاتا ہے۔ جو دنیا میں میرے سوائے باقی کسی کو کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ جس کے دل سے میرے لئے ہمدردی نیک دُعا۔ اور محبت کی شعاعیں نکلتی رہتی ہیں۔ جو خواب میں بھی میرے ہی خواب دیکھتا ہے اور تصور میں بھی میری ہی تصویر جس کے پیش نگاہ رہتی ہے جو اپنا تمام آرام و آسایش میرے لئے قربان کرنے کو ہر وقت طیار رہتا ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے۔ کہ وہ وجود گلابی مسکراہٹ لبوں پر لئے ہوئے میرے سامنے کھڑا ہے تو اس کی تمام تھکاوٹ غائب، تمام اوداسی کافور، اور تمام رنج دُور ہو جاتے ہیں۔ ایسی سرزمین واقعی بہشت بریں ہے۔ مگر پتہ تو لگ جائے۔ کہ وہ وجود دیوی ہے یا نہیں۔ اگر مجھے وہ پسند نہ آئی۔ تو کیا ہوگا؟ روز کی چڑ چڑ۔ روز کی چوں چوں۔ پتہ ہے

وہ کالی ہے، کلوٹی ہے، بدصورت ہے یا کیا ہے؟ یونہی گلے میں ڈھول ڈال لینا کوئی دانائی ہے۔
یہ سوال زندگی کا سوال ہے۔ پھر اسے دیکھوں تو کیسے؟ ایسا موقعہ ہاتھ لگے تو کس طرح؟"
اپنے کمرے میں لیٹا ہوا رام چند، اپنی آئندہ زندگی پر نظر ڈال رہا تھا۔ کہ یہ خیالات اس کے دل میں چٹکیاں لینے لگے۔ وہ ان پر سوچتا رہا۔ اور سوچتا رہا۔ یہاں تک کہ لیمپ تیل کے ختم ہونے پر بجھ گیا۔ اور کمرے میں اندھیرا ہو گیا۔ اندھیرے میں نیند نے رامچند پر قبضہ کر لیا۔ اور وہ سو گیا۔

(۲)

ہرنام رام چند کا دوست تھا۔ بڑا ہوشیار اور بڑا چالاک۔ چلتے پرند کو تیر مارتا تھا۔ اور راہ جانے والوں کا چلن بتا دیتا تھا۔ اس نے جب رام چند کی مشکلات کا حال سنا۔ تو ہنسکر بولا۔ واہ بھئی واہ!

رام چند" کیوں! میری جان تو عذاب میں پھنسی ہے۔ تم ہنستے ہو"۔
ہرنام" بات ہی ہنسنے کی ہے "
رامچند۔ ؎ تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں"
ہرنام" یار تم نرے تالے ہی ہو۔ یہ بھی کوئی بات ہے جس کے لئے تم حیران ہو رہے ہو؛ گھر سے دو دن کی اجازت لو۔ اور میرے ساتھ چلو۔ ایک گھنٹہ اپنے آپ کو میرے ہاتھوں میں چھوڑ دینا۔ اور کام بن جائے گا۔ تمہاری شکل، صورت، رنگ سب بدل دوں گا۔ پھٹے ہوئے کپڑے پہننا۔ سادھو معلوم ہو گے۔ کیا مجال جو تمہارے گھر کے بھی تمہیں پہچان جائیں۔ اس رنگ سے سسرال چلے جاؤ۔ بیوی بھی دیکھ آؤ۔ بیوی کی ماں بھی دیکھ آؤ۔ کیوں ہے نہ ٹھیک "
رام چند" یار بات تو واقعی ٹھیک ہے مگر کوئی پہچان نہ لے"
ہرنام" کیا مجال!"
رام چند" اچھا پھر کل سہی "
ہرنام" بہت خوب!"

(۳)

اس رات رام چند کو نیند نہ آئی۔ بیوی کی خیالی تصویر آنکھوں کے آگے گھومتی رہی اور دُو سے لطف آمیز نگاہوں سے دیکھا کیا۔ کبھی سوچتا۔ یہ ٹھیک نہیں۔ اگر کسی نے مجھے گالی دیدی یا دھتکار دیا تو مجھے خواہ مخواہ کا رنج ہوگا۔ اور دل میں گرہ بندھ جائے گی جس میں قصور کسی کا نہیں بلکہ اپنا میرا ہوگا۔ کبھی کہتا۔ مجھے حقیر ہونا ہوگا۔ کبھی کہتا بازاروں سے کیسے گذروں گا۔ کبھی یہ خیال آتا۔ کہ اگر راز کھل گیا۔ تو کیسی ذلت، کتنی شرمندگی، اور کستقدر ندامت کا سامنا ہوگا۔ ان خیالات میں ساری رات جنگ ہوئی مگر بیوی کو دیکھنے کے شوق نے تمام باتوں پر فتح پائی۔ رات گذر گئی۔ دن چڑھا۔ والدین سے لڑ کر، جھگڑ کر، ضد سے دو دن کی اجازت لی۔ امتحان سے فارغ ہوا ہوں۔ دل گھبرا رہا ہے۔ دوست بھی بُلا رہے ہیں۔ دو دن لاہور میں رہ آؤں گا۔ طبیعت سنبھل جائیگی۔ سیر کی سیر ہوگی۔ علاج کا علاج ہو جائیگا ہرنام میرے ساتھ ہوگا۔ ہنستے ہنستے جائینگے۔ کھیلتے ہوئے آئیں گے۔ اس میں ہرج ہی کیا ہے؟

ان ہی باتوں میں مسٹر ہرنام آگئے۔ رام چند نے جلدی جلدی سنان کیا؛ کپڑے بدلے۔ تھوڑا بہت کھانا کھایا۔ اور چھڑی ہاتھ میں لے کر گھر سے نکلے اور ہرنام کی بیٹھک میں جا پہنچے ہرنام نے مصالحہ سب تیار رکھا ہوا تھا۔ رام چند کو ایک گھنٹے میں کچھ کا کچھ بنا دیا۔ اور جب آکر سر پر لکڑی پھیر کر کہا۔ بنگالے کا جادو چل چل۔ پانی سے نہاؤ۔ مل مل۔ نہ شکل بدلے نہ صورت بدلے بولو کالی کلکتے والی کی جے۔ تو وہ بے اختیار ہنس دیا۔ شیشہ میں اپنی شکل دیکھ کر رام چند دنگ رہ گیا۔ کوئی کہہ سکتا تھا؟ کہ یہ ایم۔ اے کا طالب علم ہے۔ فقیر دکھائی دیتا تھا، وہی چال وہی گفتار، وہی رفتار،

جب ہرنام نے پوچھا: بابا! کیا چاہتے ہو؟ تو رام چند نے سنجیدہ شکل بنا کر زور سے نعرہ مارا بجیجد سے مائی نتی کا آٹا۔

ہرنام کی چھوٹی بہن نے یہ آواز سُنی۔ جھروکے سے سادھو کو دیکھا۔ اور کٹورے میں آٹا لیکر

آئی بیٹے بابا! آٹا لے اور جا۔"

ہرنام نے قہقہہ لگایا۔ رام چند صرف مسکرایا۔ اور کپڑے کا دامن آگے کر دیا۔ آٹا لے کر اس نے فرش پر رکھا۔ اور سٹیشن کی طرف روانہ ہوا۔

(۴)

ماں کی جھونپڑی کو آگ لگی ہے کوئی بجھائے گا۔

یہ آواز رامچندر کی تھی۔ جو جہلم کی اس گلی میں جا پہنچا تھا جس میں اس کے سسر کا گھر تھا۔ مکان کا نمبر وغیرہ تو اسے یاد ہی تھا۔ دیکھ دیکھ کر اسی مکان کے سامنے کھڑا ہوا۔ اور اونچی آواز سے بولا۔ ماں کی جھونپڑی میں آگ لگی ہے کوئی بجھائے گا

اندر بچوں نے شور مچا رکھا تھا۔ بڑے کام میں لگے ہوئے تھے۔ کسی نے پرواہ نہ کی دھڑکتے ہوئے دل اور کانپتے ہوئے پاؤں سے اس نے دہلیز پر قدم رکھا۔ آہ اسجگہ شگونوں کے ساتھ آنا تھا۔ جہاں میں بھکاریوں کے لباس میں آیا ہوں۔ برداشت کی سنگین دیواریں کانپ گئیں صلاح ہوئی۔ واپس چلے چلو مگر پھر خیال آیا۔ یہاں آکر واپس چلے جانا کیا معنی؟ دل کو سخت کیا۔ آگے بڑھا۔ آگے بڑھ کر پھر فقیروں والی آواز دی۔

"مائی بھوکے فقیر کو روٹی کھلا۔"

رام چند کی ساس سامنے بیٹھی ننھے بچے کو سلا رہی تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا "سنا ہو سادھو آیا ہے۔ اسے دو روٹیاں دے دے۔"

"ہو سنا" سنکر رامچند کا کلیجہ بلیوں اچھلنے لگا؛ اور چہرے کا رنگ بدل گیا۔ دیکھو میری زندگی کا ساتھی کیسا ہے۔ ایک منٹ میں وہ میرے سامنے ہوگا۔ مگر وہ نہ جانے گی کہ اس کی خوشی کا چشمہ اسکا آئندہ مالک، اسکا ہونیوالا شوہر پھٹے پرانے کپڑوں میں، فقیروں کے لباس میں اس کے پاس کھڑا دو روٹیاں مانگ رہا ہے۔ غیرت نے قدم پیچھے ہٹائے۔ مگر شوق نے نہیں پھر آگے کر دیا۔

ایک خوبصورت، پندرہ برس کی بھولی بھالی لڑکی اُس کے سامنے آئی فقیر کے جسم میں
بجلی دوڑ گئی۔ موہنا نے روٹیاں فقیر کے ہاتھ میں دیں۔ اُس کی نبض تیز ہو گئی۔ ؎
بدن چھو گیا آگ سی لگ گئی نظر مل گئی دل دھڑکنے لگا۔
نظر کا نظر سے ملنا تھا۔ کہ دونو طرف شرم نے مُنہ لال کر دیئے۔ ایک کا اس لئے کہ یہ پرایا آدمی ہے۔ دوسرے کا اس لئے کہ یہ میری عورت ہے۔ مگر مجھے اسوقت جانتی نہیں۔ یہ خیال کہ میرے گلے بلا بندھ جائے۔ غلط ثابت ہُوا۔

موہنا کی شکل وصورت رام چند کو ایسی پیاری لگی۔ کہ ایک ہی بار دیکھ کر واپس جانے کو جی نہ چاہا۔ فقیر کے لباس میں ایک ایم۔ اے کے طالب علم کے لئے دن گذارنا سخت مشکل بات ہے۔ مگر موہنا! تجھے ایک بار اور دیکھنے کے لئے سب تکلیف منظور ہے۔ دن گذرا شام ہوئی پھر اُسی گلی میں جا پہنچے۔ اب جب وہ سُسر کے گھر کے سامنے پہنچا۔ تو اسے سامنے کے گھر میں دو تین اور لڑکیوں کے ساتھ موہنا ہنستی کھیلتی دکھائی دی۔ وہ اِدھر اُدھر پھرنے لگا۔ اور اُن کی گفتگو سُننے لگا۔ موہنا نے کہا "میرا پتی میرے قابو میں رہے گا"۔

یہ سن کر رام چند ذرا مسکرایا۔ اتنا غرور، اتنا تکبر۔ اس مُسکراہٹ میں غصّہ تھا، ہمدردی تھی۔ اور محبت تھی۔ اسی رات وہ گجرات واپس آگیا۔

(۵)

رام چند کے دل میں عجیب عجیب خیالات آنے لگے۔ اُسے موہنا کو دیکھتے ہی اس سے محبت سی ہو گئی تھی۔ اس محبت کے دریا میں بہہ کر وہ کوشش کرتا تھا۔ کہ وہ بات بھُول جائے جس سے اُسے غصّہ چڑھ گیا تھا۔ میں پتی کو اپنے قابو میں رکھوں گی۔ یہ الفاظ مغرور سینے سے نکلے تھے۔ اس لئے بھولتے نہ تھے۔ وہ بھُولنا چاہتا تھا۔ مگر انسان جس بات کو بھولنا چاہتا ہے۔ وہ بات اُسے بھُول نہیں سکتی۔ بسااوقات بھولی بھالی موہنا کی دلفریب صورت اس کے سامنے آ آ کر اُسکے خاموش غصّے کو فرو کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ مگر جب ہی اُس کے الفاظ مغرور

کے کانوں میں گونجتے۔ موہنا کا بھولا پن غائب ہو جاتا۔ اور وہ شوخ وطرار اور مغرور حسن نازنین کے لباس میں ظاہر ہوئی۔ تصور ہی تصور میں تصویر اس کے آگے ہاتھ جوڑتی ماتھا رگڑتی۔ اور معافیاں مانگتی۔ مگر رام چند خیالی تصویر کے خیالی معافی نامہ کو بھی منظور نہ کرتا۔ ان تصورات میں اُسے حقیقی خوشی نصیب ہوتی تھی۔ اور جب اُسے کوئی آ کے بُلا دیتا۔ اُسے غصہ چڑھ جاتا۔ گویا کہ اُس کی بادشاہت لُٹ گئی ہے

وقت دریا کے پانی کی طرح بہتا گیا۔ چھ ماہ گذر گئے۔ رام چند پھر اسی دروازے پر گیا جہاں وہ پہلے جا چکا تھا۔ مگر پہلے جانے اور اب کے جانے میں زمین اور آسمان کا فرق تھا۔ پہلے وہ فقیر بن کر، ڈرتا ڈرتا۔ کانپتا کانپتا اندر داخل ہوا تھا۔ اب اس کے ساتھ باجوں کا شور اور برات کا غل تھا۔ محلے کے لوگ کوٹھوں پر سے اُسے دیکھتے تھے اس کے سر پر سہرے تھے اور آنکھوں میں خمار۔ یار دوست اُس کے آگے پیچھے پھرتے تھے۔ اور وہ کسی سے نظر نہ ملاتا تھا

جب لڑکی کے پتا نے لڑکی کا ہاتھ اُسے دیا، اُس کے دل میں محبت نے زور مارا۔ مگر جب وہ الفاظ یاد آئے۔ محبت غصے میں تبدیل ہوگئی۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ "پتی کو قابو میں لے آؤ پھر بات ہوگی"۔

شادی ہوگئی۔ دو آدمیوں کو سوسائٹی نے آپس میں مل بیٹھنے کی مذہب کی طرف سے آزادی دیدی۔ اور اُن کو ایک دوسرے کا بنا دیا۔ مگر رام چند نے محض ایک دفعہ موہنا کو کہا کہ "تم مجھ کو قابو کر لو۔ پھر بات جیت ہوگی اور بس۔"

کئی دن گذرے۔ کئی راتیں گذر گئیں موہنا کے دل میں جو ولولے، جو ارمان، جو خیالات تھے۔ اُن پر پانی پڑ گیا، پُر جوش دل ٹھنڈا ہو گیا۔ وہ اندر ہی اندر جلتی تھی۔ مگر کیا مجال جو کوئی تاڑ جائے۔ آنسو آتے تھے، مگر آنکھوں سے نہ نکل سکتے تھے۔ موہنا انہیں پی جاتی تھی۔ اور کسی پر ظاہر نہ ہونے دیتی تھی۔"

آخر ایک رات صبر کا پیمانہ لبریز ہو کر چھلک پڑا۔ اُس نے کہا پتی میرا ہے۔ میرا اُس پر قبضہ ہے۔ وہ مجھ سے کہاں بھاگے گا۔ مجھ سے کہاں جائے گا۔ یہ سوچکر یہ سمجھ کر بو جان کر وہ پتی کے کمرے میں گئی۔ دیکھا پتی سویا پڑا ہے۔ اور لمپ کی روشنی میں اُس کا منہ دیوتاؤں کی طرح چمک رہا ہے۔ یہ دیکھ کر دبی ہوئی محبت جاگ پڑی۔ وہ چور کی طرح دبے پاؤں اندر داخل ہوئی اور خاموش کھڑی ہو گئی۔ اُس کی نگاہ پتی کے چہرے پر تھی۔ اور دل کا پتہ نہ تھا۔

دس.... پندرہ..... بیس منٹ گذر گئے۔ موہنا اسی طرح کھڑی رہی۔ آخر کار اس سے نہ رہا گیا۔ وہ پتی کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ اور پاؤں پکڑ کر گود میں رکھ لئے۔ یکلخت رام چندر چونک کر اُٹھ بیٹھا۔ اور موہنا کو اپنے کمرے میں دیکھ کر کہنے لگا۔ تم یہاں کیوں آئی ہو؟

موہنا نے پتی کی طرف دیکھا اس عصمت بھری نگاہ میں محبت، ہمدردی اور معذرت کا پیغام تھا۔ اُس نے کہا "پتی دیو! میرا قصور معاف ہو" نگاہ سے نگاہ کا ملنا تھا۔ کہ دل سے دل مل گیا۔ رام چندر نے موہنا کو کھینچکر گلے سے لگا لیا۔ اور کہا۔ موہنا! موہنا!! ایک نگاہ میں تم نے مجھے اپنا کر لیا اب میں تمہارے قابو میں ہوں ❖

انصاف کی کرسی

مدھوسودن ہمیرپور کے ممتاز اشخاص میں سے تھے۔ کبھی اُنہوں نے بہت تنگ دن دیکھے تھے۔ مگر اب اُن کے دروازے پر ہاتھی جھومتا تھا۔ اور باہر نکلتے تھے۔ تو لوگ جُھک جُھک کر سلام کیا کرتے تھے۔ بانکے آدمی تھے۔ پُورے اپ ٹو ڈیٹ۔ چہرے سے شان ٹپکتی تھی۔ اور انصاف پسندی کا رنگ مستک پر جھلکتا تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ امیر کو افلاس میں امارت نہیں بھُولتی۔ مگر غریب کو امیر بن کر غریبی بھُول جاتی ہے۔ شاید یہ ٹھیک ہو۔ لیکن جس نے ایک دفعہ بھی مدھوسودن کو دیکھ لیا۔ وہ اس ضرب المثل کی راستی میں شک کرنے لگ جاتا تھا۔ مدھوسودن جب کبھی چار یاروں میں بیٹھتے۔ اپنی غریب ماں اور مفلس باپ کا ذکر ضرور کرتے۔ مانتے کہ وہ غریب تھے۔ مگر فخر کرتے کہ وہ ان کے والدین تھے۔ اُنہوں نے کبھی مفلس والدین کا غریب ہونے کی وجہ سے شرمندگی محسوس نہیں کی۔ یہ اُن میں خاص وصف تھا۔

بچپن کے وُہ دن اُن کی آنکھوں میں پھرا کرتے تھے۔ جب وہ نلنی کے ہمراہ مٹی کے گھر بنایا کرتے تھے۔ اور پھر کسی آنے جانے کو کھڑا کر کے اُس سے پُوچھتے تھے۔ ذرا بتلاتے جاؤ۔ کس کا گھر اچھا۔ کس کا گھر بُرا؟!

کبھی نلنی جیت جاتی کبھی مدھوسودن۔ جب نلنی شکست کے خیال سے کونے میں مُنہ چھپا کر رونے لگتی۔ تو مدھوسودن کے کلیجے پر چوٹ پہنچتی۔ وہ اُس کے نزدیک جاتے اور اُسے پچکار کر چُپ کراتے۔ مدھوسودن اُسے تسلی دیتے۔ تو وہ کالی ناگن کی طرح سر اُٹھاتی۔ اور کہتی۔ تم نے اچھا گھر کیوں بنایا تھا۔ مدھوسودن سہم جاتے۔ فتح کے خیال سے بھرپُور سر جھک جاتا اور کہتے۔ پھر نہ ہوگا۔ نلنی یہ سُنتی۔ اور قہقہہ مار کر ہنس پڑتی۔ یہ طفلی کے دن گذر گئے۔ مگر مدھوسودن کی آنکھوں

میں موجود تھے۔ اب اُن کے دن پلٹ چکے تھے۔ اور وہ منصف تھے۔ انسانی زندگیاں اُن کے قلم کی ایک گردش سے ادھر ادھر ہو جاتی تھیں۔ جس طرف وُہ مہر کی نظر سے دیکھتے۔ وہ نہال ہو جاتا۔ مگر جس طرف اُن کی قہر آلودہ آنکھیں اُٹھ جاتیں، وہ دل ہی دل میں جل بھُن کر رہ جاتا۔ اور سمجھتا کہ اب قسمت آنکھیں پھیرا چاہتی ہے۔

اب یہ حال تھا۔ مگر بچپن کے افلاس میں اُن کے ساتھ مٹی کے گھر بنانے والی نلنی اُنکو نہ بھولی تھی۔ گھر میں کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ اور چہرے سے ستائیسواں سال جا رہا تھا۔ کئی جگہ سے پیغام آئے۔ بڑے بڑے امیروں نے بات چیت کی۔ مگر جس دل میں نلنی بیٹھ چکی تھی، وہاں کوئی دوسرا جگہ نہ پا سکا۔ نلنی غریب تھی۔ اور غریب باپ کی بیٹی تھی۔ مگر مدھوسودن سمجھتے کہ امیر سے امیر لڑکیاں نلنی کے پیر دھونے کے بھی قابل نہیں ہیں۔ وہی تصویر تھی جسے وہ پُوجا کرتے مگر نلنی اور اس کے والدین کا ایک عرصہ سے پتہ نہ تھا۔

(۲)

جو خوشی چکور کو چاند نکلنے سے۔ سانپ کو بین بجنے سے اور پتنگے کو شمع دیکھنے سے ہوتی ہے وہی خوشی مدھوسودن کو حاصل ہوئی جب اُسے معلوم ہوا۔ کہ اُس کے لٹے ہوئے دل کی حقیقی ملکہ۔ اس کی بہارِ بچپن کی حسین رفیقہ۔ اُس کے عالم تنہائی کی اکیلی یادگار پھر سے ہری پوری میں آگئی ہے۔ اُس کا باپ رام بھروسے آگے سے زیادہ بوڑھا ہو چکا تھا۔ اور نلنی اپنے بچپن کے صحن سے گزر کر شباب کے کمرے میں قدم رکھ چکی تھی۔ مکان آمنے سامنے تھے۔ مدھوسودن بشّاش چہرے اور مسکراتی ہوئی نگاہوں کے ساتھ اپنے بچھڑے ہوئے پڑوسی کے دروازے پر گئے۔ اور ہنسکر بولے "چاچا! آپ آگئے۔ اچھا ہُوا۔ اتنا لمبا عرصہ کدھر رہے۔ دل آپ لوگوں کی جدائی کو تلخی سے محسوس کرتا تھا۔ اور آنکھیں آپ کو ادھر ادھر ڈھونڈھتی تھیں۔ میرے تو ماتا پتا اب آپ ہی ہیں۔ پتا اور ماتا دونو سورگ کو سدھار گئے۔ اور میں بدبخت دُنیا میں اکیلا رہ گیا۔"

رام بھروسے کی کچھ شان بن گئی تھی۔ روپیہ کما کر لایا تھا۔ کہا ہنسکر بولا "کیا کہوں؟ پیٹ کے لئے کیا کچھ کرنا نہیں پڑتا۔ اتنا عرصہ کلکتہ میں ہی رہا۔ تمہارے مائی باپ اچھے تھے۔ پرماتما انہیں سورگ میں رکھے۔ تم بھی سعادتمند ہوا۔ ہم تو تمہیں انہیں آنکھوں سے دیکھتے ہیں جن سے شیام اوتار کو دیکھتے ہیں"

مدھوسودن نے ادب سے سر جھکا دیا۔ اور کہا یہ آپ کی عنایت ہے۔ نیا اسباب مکان میں رکھا جا رہا تھا۔ رام بھروسے نوکروں کو ہدایات دینے کے لئے ایک طرف ہوئے۔ تو نلنی آموجود ہوئی۔ اب اس میں مہکتے ہوئے پھول کی شان تھی۔ مگر چہرے پر پہلی سی ہی معصومیت کی جھلک تھی۔

مدھوسودن نے ہنسکر کہا "نلنی راضی ہو۔ تم نے کبھی ہمیں بھی یاد کیا تھا۔ ہم تو تمہیں کبھی نہیں بھولے"

نلنی کا سارا جسم کانپ گیا۔ اور نگاہیں اوپر اٹھانے سے نہ اٹھیں نیچے زمین کی طرف دیکھتے ہوئے ہی اس نے کہا "میں آپ کو یاد رکھا کرتی تھی۔ مگر یہ تو کہئے۔ آپ کی بیوی آج کل یہیں ہیں کیا؟"

اس وقت نلنی کے چہرے کا رنگ۔ عجیب ہو رہا تھا۔

مدھوسودن نے قہقہہ لگایا۔ اور کہا میری تو شادی ہی نہیں ہوئی"

نلنی نے ٹھنڈی سانس لی۔ اور اسی دم رام بھروسے دیری کے لئے معذرت کرتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے اور دونوں کی باتیں دل ہی دل میں رک گئیں۔

آٹھ دن کے بعد نلنی اور مدھوسودن کی شادی کی طیاریاں ہونے لگیں۔

———(۳)———

"کیا کروں! آہ کیا کروں؟ ایک طرف غرض ہے۔ دوسری طرف فرض ہے۔ ایک طرف محبت ہے۔ دوسری طرف انصاف ہے۔ ایک طرف دنیا ہے۔ دوسری طرف دین ہے۔ غرض

جنون یا فرض۔ محبت لوں یا انصاف۔ دین کا بنوں یا دُنیا کا۔ پیاری للی کے نام پر حرف آجائے گی۔ مانا کہ اس کی غلطی ہے۔ مگر کون انسان ہے۔ جو غلطی نہیں کرتا۔ لیکن ...... کیا ایک کمینی عورت میری بیوی بن سکتی ہے۔ بالکل نہیں۔ میں اس کی شکل پر نہیں مر رہا۔ میں اُس کے خوبصورت دلپر فدا تھا۔ دل بُرا ہے۔ شکل بُری ہے۔ میں اُس کو اب نہیں چاہتا اور نہ چاہونگا

رات کی تاریک تنہائی میں دُنیا سوتی تھی۔ مگر مدھوسودن چار پائی پہ لیٹے تڑپتے تھے اور اُوپر کے الفاظ دوہرا رہے تھے۔ کچھ توقف کرنے کے بعد پھر لبوں کو جنبش ہوئی۔

نہیں معمولی بات ہے میرے پاس اگر وہ ایسی نہیں رہے گی۔ میں اُسے ٹھیک کر لونگا صحبت کیا کچھ نہیں کر دیتی۔ مگر کیا لوگ مجھ پہ الزام تو نہیں لگائینگے۔ انہیں لوگوں کا مجھ پر اعتبار ہے۔ گورنمنٹ کو مجھ پر بھروسہ ہے۔ میرے ایک قلم کے جنبش سے پیاری للی کی آن رہ جائے گی۔ بلا سے ایک دفعہ جھوٹ بول دیا۔ تو کیا ہوا

یہ سوچکر اور دل کو فیصلے سے ہلکا کر کے مدھوسودن کروٹ بدل کر سو گئے۔

(۴)

آج مدھوسودن کی کچہری میں خاص رونق تھی۔ لوگ جوق درجوق اُمڈے چلے آتے تھے جو کبھی تماشہ دیکھنے کو گھر سے باہر نہ نکلتے تھے۔ جو کبھی کبھی خالی تقریبوں پہ باہر نہ نکلتے تھے۔

آج اُنہوں نے بھی اپنے جوتوں کو صاف کیا۔ اور سنوار سنوار کر پگڑی باندھنے لگے آدمیوں کا ایک سمندر تھا۔ جو ٹھاٹھیں مارتا ہوا کچہری کی طرف جا رہا تھا۔ اور واپس آنے کو راستہ نہ تھا۔ کھوے سے کھوا چلتا تھا۔ اور تل زمین نہ دیکھ سکتا تھا۔ پاؤں کو پاؤں دباتا تھا۔ مگر نگاہ نگاہ کو نہ دیکھ سکتی تھی۔ ہوا خراب ہو رہی تھی۔ اور لوگوں کا دم گھٹتا تھا۔

مدھوسودن عدالت کی کرسی پر آئے اور چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ سپاہیوں نے ڈنڈا چلایا۔ اور سب کو باہر نکال دیا گیا۔ یہ وہ وقت تھا۔ جب لحاظ کام آتا ہے۔ اور روپیہ پیسہ جگہ پیدا کر دیتا ہے خاص خاص آدمی اندر داخل کئے گئے۔ اور مقدمہ پیش ہوا

نلنی ایک پالکی میں بیٹھ کر آئی۔ اور کٹہرے میں نیچی نگاہیں کرکے کھڑی ہو گئی۔ مدعی کے وکیل نے ایک مدلل تقریر کی۔ اور ثابت کیا۔ کہ رام بھروسے جو تھوڑے ہی عرصے میں اتنا امیر بن کر آ گیا ہے۔ اس میں بے ایمانی اور بددیانتی کا بہت کچھ ہاتھ ہے ایسے باپ کی بیٹی سے یہ بعید نہیں ہے۔ کہ وہ چوری کرکے پندرہ ہزار روپیہ چرا لے

تقریر کے بعد گواہ پیش ہوئے۔ اور اُن کے بیانات سُن کر تو حاضرین کو یقین ہو گیا کہ نلنی سے ضرور یہ جرم سرزد ہو گیا ہے؛

مدھوسودن نے کہا "نلنی تو کہہ۔ کیا کہتی ہے"

نلنی نے ایک دفعہ اپنی خوبصورت آنکھیں اُونچی اُٹھائیں۔ اور کہا "میں بے گناہ ہوں اور یہ سب مجھ پر الزام ہے"

مدعی کے وکیل نے کہا "روپیہ تمہارے اندر سے برآمد ہوا ہے۔ اس سے بڑھ کر اور ثبوت کیا ہو سکتا ہے۔ اچھا یہ لو ایک اور ثبوت مدھوسودن کانپ گئے مگر وکیل نے جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ اور ایک خط نکال کر پڑھنا شروع کیا؛

پیارے پتا جی!

میں جا رہی ہوں۔ صندوق وغیرہ سب میں نے دیکھے ہوئے ہیں۔ روپے لاکر ہی رہونگی آپ جب ہی گھر آئیں۔ جگیندر ناتھ کے دروازے پہ پہنچ جائیں۔ یہ نہایت ضروری ہے۔ آپ سیر میں ہی بیٹھ رہے۔ میں زیادہ انتظار نہیں کر سکتی"

نلنی چلّا اُٹھی "یہ خط میرا نہیں ہے"

وکیل نے نفرت آمیز مُسکراہٹ کے ساتھ نلنی کی طرف دیکھا۔ نلنی کا وکیل آگے بڑھا اور اس نے خط غور سے دیکھ کر نلنی کے آگے کر دیا۔ نلنی کا رنگ فق ہو گیا۔

مدھوسودن ہوا میں پاگلوں کی طرح دیکھنے لگے۔ پھر سمجھے۔ اور فیصلہ لکھنے لگے۔ لوگ سرگوشیاں کرنے لگے۔ کہ دیکھیں۔ فیصلہ انصاف کی طرف جاتا ہے۔ یا حُسن کی طرف آخر مدھوسودن

کھڑے ہوئے اور مختصر فیصلہ سُنا دیا۔ جرم ثابت ہے۔ نلنی کو ایک سال قید محض کی سزا دیجاتی ہے۔ نلنی کا باپ چیخ مار کر بیہوش ہوگیا۔ حاضرین نے مرحبا مرحبا کے نعرے بلند کئے نلنی ایماندار منصف کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔ اور مدھوسودن ایک استقلال بھرے چہرے کے ساتھ کرسی پر بیٹھ گئے۔

(۵)

ابھی لوگ اپنی اپنی جگہ پر ہی بیٹھے تھے۔ کہ ایک عورت چلاتی ہوئی عدالت کے کمرے میں داخل ہوئی۔ اور منصف کو مخاطب کر کے کہنے لگی " میری بات سُن لو"

سینکڑوں نگاہیں اُس کے چہرے پر گڑ گئیں۔ نلنی کا باپ بھی سنبھل گیا۔ نلنی بھی سنبھل گئی۔ اور مدھوسودن بھی سنبھل گئے۔ پنسل کو منہ میں ڈالتے ہوئے مدھوسودن بولے " بہن بول تو کیا کہنا چاہتی ہے؟"

عورت نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ گویا دھڑکنے والے دل کو دھڑکنے سے باز رکھنا چاہا۔ اُس نے چاروں طرف دیکھا۔ اور کہا۔

"میرا بولنا مجھے کانٹوں کے قفس میں قید کروا دے گا۔ یہ میں جانتی ہوں مگر انصاف کو پردے سے ڈھکا ہوا میں دیکھنا نہیں چاہتی۔ کہ ایک بے گناہ پر سنگین الزام لگایا جائے اور حسین و دلفریب چہرے پر کالا رنگ مل کر اُسے تشہیر کیا جائے میں نہیں چاہتی۔ کہ ایک گنہگار آدمی بے گناہوں کو ستاتا رہے۔ اس لئے میں وہ کہوں گی۔ جو سچ ہے۔ خواہ یہ سچ مجھے کتنا ہی مہنگا کیوں نہ پڑے۔

" پانی کا پانی اور دودھ کا دودھ کرنے والے منصف! نلنی بے گناہ ہے۔ قصور سارا جگبندر ناتھ کا ہے۔ وہ میرا بھائی ہے مگر گنہگار ہے۔ اس لئے میں اُس کے خلاف آواز بلند کرتی ہوں نلنی نے کوئی چوری نہیں کی۔ یہ سب جگبندر ناتھ کی شرارت ہے۔ اُسی نے رات کو نلنی کے گھر میں روپے داخل کرائے۔ اور صبح کو پیشتر اس کے کہ اُنہیں پتہ لگے۔ اُن کو حراست میں

لے لیا گیا۔ ہاں آپ کہتے ہیں۔ کہ وُہ رقعہ نلنی کے ہاتھ کا ہے۔ یہ غلط ہے اور بالکل غلط ہے۔ وُہ میرے ہاتھ کا لکھا ہوُا ہے۔ میرا دستخط نلنی سے بالکل ملتا جلتا ہے۔ یہ آپ اب دیکھ سکتے ہیں میرا بھائی جگیندر ناتھ بدکار ہے۔ اُس نے نلنی سے شادی کرنا چاہا۔ مگر جواب صاف ملنے پر وُہ اُس کی عزت کا دُشمن ہو گیا۔ اور اُس نے وُہ کیا۔ جسکا اظہار میں کر رہی ہوں۔

مُیری گردن پر چھری رکھ کر جگیندر ناتھ نے مجھے کہا۔ کہ تم جو کچھ میں کہتا ہوں لکھدو۔ میں نے انکار کیا۔ اور بار بار کیا۔ مگر میری نہ سنی گئی مطلق نہ سُنی گئی۔ آخر جان کے خوف سے میں جھک گئی۔ اور میں نے وہی لکھدیا۔ جو جگیندر ناتھ نے مجھے کہا تھا۔ مگر اُسی وقت میں نے فیصلہ کر لیا تھا۔ کہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ مگر نلنی پر حرف نہ آنے دوں گی۔ جگیندر ناتھ یہ سمجھ گیا تھا۔ اور اس نے مجھے کوٹھڑی میں بند کر چھوڑا تھا۔ آج مجھے موقعہ مل گیا۔ اور میں ادھر آ گئی"

نلنی نے احسانمند نگاہوں سے آسمان کی طرف دیکھا۔ نلنی کے باپ نے غرور کی نگاہوں سے مدعی کی طرف دیکھا۔ اور مدھوسودن نے للچاتی ہوئی نگاہ سے باپ بیٹی کی طرف دیکھا اس نگاہ میں معذرت کا سہا۔ اور سمٹا ہوُا پیغام تھا۔

(۶)

انسان کرتا کچھ ہے اور ہو کچھ جاتا ہے۔ جگیندر ناتھ نے مایوس ہو کر نلنی کو اس طرح بدنام کرنا چاہا تھا۔ کہ وُہ غریب ساری عمر کے لئے کسی کو مُنہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔ مگر مارنیوالے کی نسبت بچانے والے کی راہیں تیار ہیں۔ بہین نے عدالت میں جا کر بھائی کے خلاف گواہی دی۔ نلنی باعزت بری ہوئی۔ اور جگیندر ناتھ پر اُلٹا مقدمہ چلا

نلنی کے باعزت بری ہونے سے سب سے زیادہ خوشی مدھوسودن کو ہوئی۔ جس نے انصاف کے نام پر اپنی ہونے والی پیاری بیوی کو بھی سزا دینے سے پہلوتہی نہ کی تھی۔

گھر آ کر مدھوسودن نے رام بھروسے کو لکھا

"عدالت میں میں نے جو کچھ کیا تھا۔ اُس سے اُمید ہے۔ آپ خفا نہ ہوئے ہونگے۔ کیونکہ اُسوقت میری پوزیشن کچھ اور تھی۔ میں نے وُہ کیا تھا جو کرنا مجھے مناسب تھا۔ مجھے انصاف کی کرسی پر بٹھایا گیا تھا اس لئے بے ایمانی کرنا مجھے مناسب نہ تھا۔

یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا۔ کہ دیوی نلنی کے باعزّت بری ہونے سے مجھے بھی خوشی حاصل ہوئی ہے۔ اور اُتنی ہی ہوئی ہے۔ جتنی کہ آپ کو۔ اس باب میں میری دِلی مُبارک باد قبول فرمائیے

آپ کا بیٹا

مدھوسودن

اس خط کا جواب کوئی نہ ملا۔ مگر پندرہ دن کے بعد دونو شادی کی رسوم سے جکڑے گئے۔ منہ دکھائی کی رسم کے وقت نلنی نے مُنہ کو گھونگھٹ سے چھپا لیا۔ اور ایک کونے میں بیٹھ رہی مدھوسودن نے کئی باتیں کیں مگر اُس نے جواب نہ دیا۔ آخر مدھوسودن بولے "پریتما! تم سے بھی نہ بولوگی۔ میں تو تمہاری صورت دیکھنے کو کب سے ترس رہا تھا۔ مگر اب تم ہو کہ گھونگھٹ ہی نہیں کھولتیں۔

نلنی نے اسکا بھی کوئی جواب نہ دیا۔ خاموش رہی۔

مدھوسودن نے کہا "سچ مچ عورتیں بڑی سنگدل ہوتی ہیں"

نلنی نے کہا "اور مرد تو بڑے رحمدل ہوتے ہیں نہ!"

مدھوسودن نے کہا "کہو میں نے کیا سنگدلی کی ہے"

نلنی نے جواب دیا "اپنی منگیتر کو قید کا حکم دے دینا حد درجہ کی نرم دلی ہے نہ"

مدھوسودن کو کچہری کا سارا نظارہ یاد آیا۔ اور بے قرار ہو گئے۔ اب نلنی کی تصویر آنکھوں کے آگے ناچنے لگی۔ جو مدھوسودن کی طرف دیکھتی تھی۔ اور رحم کے لئے التجا کرتی تھی تھوڑی دیر مدھوسودن چُپ چاپ کھڑے رہے۔ پھر بولے!

آہ! تم ابھی تک مجھ سے ناراض ہو۔ اور اس لئے کہ میں نے انصاف کیوں کیا۔ اے کاش

پرماتما نے مجھے انصاف کی کرسی سپرد نہ کی ہوئی "

نلنی نے اُٹھ کر اپنے آپ کو مدھوسودن کے پاؤں پر گرادیا۔ اور کہا "آپ ایسے انصاف پسند شوہر پر تو مجھے فخر ہے "

مدھوسودن نے اُسے اٹھا کر گلے سے لگا لیا۔ اور کہا "میرا پہلے سے ہی خیال تھا۔ کہ تم میری اس بات کو ناپسند نہ کروگی "



پرماتما کی آواز

آخر کار میں نے مدن کا اشتہار اخبارات میں دے ہی دیا۔ اشتہار کا نکلنا تھا کہ دھڑا دھڑ آرڈر آنے لگے۔ میرے مضامین مشہور رسائل میں نکلتے رہے تھے۔ اس لئے میرے نام میں کچھ کشش پیدا ہو چلی تھی۔ اُسی کشش نے مدن کے اجرا کے شروع میں ہی میرے متذبذب دل کو چٹان کی طرح مضبوط کھڑے پانی کی طرح مطمئن اور چاند کی طرح بشاش کر دیا۔ میں نے پہلا مضمون "کاغذ کی کشتی پانی میں" لکھا تھا۔ مگر جب مدن کی قدر دانی دیکھی۔ تو اُسے دیکھ کو جی نہ چاہا۔ لکھا لکھایا پڑا رہا۔ دوسرے اخبارات مجھ پر رشک کرنے لگے پہلے ماہ میں ہی چار سو خریدار ہو جانا اور ایڈیٹر کو بارہ سو روپیہ وصول ہو جانا ایک ایسا معجزہ تھا۔ جسے میرے نام نے امر واقعہ کر دکھایا۔ میں بیٹھتا تو اپنی کامیابی پر پھولا نہ سماتا۔ اور مسرت کا رنگ میری آنکھوں میں چمکنے لگتا۔ بازار میں نکلتا۔ تو مجھے دیکھ کر آنکھیں سرگوشیاں کرتیں۔ اور سر سجدہ بجالاتے۔ ماہ بماہ خریدار بڑھنے لگے۔ اور سال کے خاتمے پر مدن تین ہزار شائع ہونے لگا۔ اس کے مضامین کی چاروں طرف دھوم مچ گئی ہیں جب گاڑی میں سفر کرتا۔ تو مدن کئی ہاتھوں اور کئی جیبوں میں دکھائی دیتا۔ میرا دل خوشی سے اُچھلتا اور مجھے نشہ سا محسوس ہونے لگتا۔ میرے ناواقف مگر قدردان خریدار جب میری اور میرے پرچے کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے۔ تو میں سر جھکا کر خاموش رہتا۔ وہ مجھے نہیں جانتے تھے اور پھر بھی میری تعریف کرتے تھے۔ اس لئے اُن کی رائے بے لاگ تھی۔ اور اُن کی باتیں زبان سے نہیں۔ بلکہ دل سے نکلتی تھیں۔

—— (۲) ——

اطلاعی کارڈ پر اوما کا نام دیکھ کر میں پھڑک اُٹھا۔ اور جلدی سے شیشے کے سامنے ہو کر اپنی شکل وصورت کو دیکھتے ہوئے میں نے نوکر کو کہا۔ میزوں کو ٹھیک کرو۔ کرسیاں ترتیب سے رکھو۔ یہ چھلکے پڑے ہیں۔ اِن کو دُور کرو۔ وُہ دیکھو جالا لگا ہُوا ہے۔ اسے اُتارو۔ اس کونے میں ہڈی پڑی ہے۔ اُسے بھی اُٹھالو۔ میں بھی لیس ہو گیا۔ کمرہ بھی صاف دکھائی دینے لگا آرام کرسی پر لیٹ کر اور اپنا ایک تازہ مضمون ہاتھ میں لے کر میں نے نوکر کو کہا "اب تم جاؤ۔ اور اُن کو عزت سے لے آؤ۔"

مِس اُوما میرے رسالے کی خریدار تھی۔ اور ہر مہینے کچھ نہ کچھ تحفہ بھیجا کرتی تھی اس کے خطوط میں عقیدت کا رنگ جھلکتا تھا۔ اور لفظ لفظ سے محبت کی بُو آتی تھی۔ یہ میرے مضامین تھے جنہوں نے اس کے دل میں میرے لئے جگہ بنا دی تھی۔ اس کے خطوط دیکھ کر میرے دل میں بھی اُسے دیکھنے کی خواہش پیدا ہو چلی تھی۔ ایک عرصہ سے وہ آنیکا اقرار کر رہی تھی لیکن چونکہ بڑے باپ کی بیٹی تھی۔ اس لئے کوئی نہ کوئی کام آپڑتا۔ اور اُسکا وعدہ دوسرے وعدے پر ملتوی ہو جاتا۔ اب وہ میرے دروازے پر کھڑی تھی۔ تو اُس کی آنکھوں میں چھپنے کی آرزو ہوئی۔ سات ماہ کے بعد آئینے سے پردہ ہٹا۔ میں نے منہ دھویا۔ مونچھوں کو صاف کیا۔ اور رومال سے چہرے کو رگڑ رگڑ کر صاف کیا۔

کھٹ کھٹ کی آواز کے ساتھ میرے دل نے بھی دھڑکنا شروع کر دیا۔ اسی لحظہ میں خوبصورت۔ نازک اندام اوما کمرے میں داخل ہوئی۔ میں نے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ اُٹھ کر اُسکا استقبال کیا۔ اور اُسے کرسی پر بٹھا دیا۔ میرا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ اور اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے جھلک رہے تھے۔

میں نے کہا "آپ کو دیکھنے کی بڑی خواہش تھی۔ آج پوری ہو گئی۔"

اُوما نے سر جھکائے ہوئے جواب دیا "میری بھی بڑی خواہش تھی۔ جو مجھے اتنی دُور سے کھینچ لائی۔ آپ کو خواہش ہوتی تو سندیش پور نہ آجاتے۔"

میں خواب نہ دے سکا۔ خاموش رہ گیا۔ اُوما مسکرائی اور پھر اِدھر کی باتیں شروع ہوگئیں۔

(۳)

گرجا کی طرف سے میں دن بدن زیادہ لاپرواہ ہوگیا۔ رات دن کے چوبیس گھنٹوں میں سے اٹھارہ گھنٹے میرے اوما کے ساتھ کٹنے لگے۔ گرجا نے میرے اطوار کو دیکھا۔ میری بدلی ہوئی نگاہ کو دیکھا۔ میری اکھڑی ہوئی گفتگو کو دیکھا۔ اور سب کچھ جان گئی۔ مگر خاموش رہی۔ کئی دفعہ میں نے اُسے روتے ہوئے دیکھا۔ مگر وہ جب ہی مجھے دیکھتی۔ آنسو پونچھ ڈالتی۔ اور مسکراتے ہوئے چہرے سے میرے پاس آجاتی۔ میں مکاری سے اُسکا ہاتھ پکڑ لیتا۔ اور پیار سے کہتا۔ گرجا تم اُداس کیوں ہو؟ گرجا مسکراتی اور چپ ہو رہتی۔

مگر یہ بناوٹ بھی زیادہ دیر نہ رہ سکی۔ لاپرواہی اور بھی ترقی کر گئی۔ اور میں گھر کی ضروریات سے بھی غافل ہوگیا۔ گرجا کڑھتی تھی۔ اندر ہی اندر جلتی تھی۔ مگر زبان سے ایک لفظ نہ نکالتی تھی اُس کا ہنس مکھ چہرہ زرد پڑنے لگا۔ اور سر درد کی شکایت اکثر رہنے لگی۔

(۴)

اوما کے نزدیک جا کر مجھے راحت ملتی تھی۔ اور میرے نزدیک آکر وہ خوش ہوتی تھی۔ یہ بھی خیال تھا۔ اور اس کا بھی ارادہ تھا۔ کہ ہم دونو شادی کرلیں۔ آہ پھر کیسا مزا ہوگا۔

مسٹر شیام جی میرے احباب میں سے تھے۔ اُن کے ہاں لڑکا ہؤا۔ تو اُنہوں نے ڈرامیٹک پرفورمینس دینے کی صلاح کی۔ مجھے بھی مدعو کیا گیا۔ میں وحشت پسند آدمی تھا۔ ایسے جلسوں میں شامل ہونے سے نفرت تھی۔ مگر اوما نے شکنتلا کا پارٹ ادا کرنا تھا۔ اس لئے جانا ضروری تھا۔

گرجا کو بخار چڑھا ہؤا تھا۔ اور وہ بے رحم موت کا کھلونا بن رہی تھی۔ جب میں کپڑے پہنکر گھر سے نکلنے لگا۔ تو اُس نے کہا۔ "آپ کب تک آئینگے"؟

میں نے جلدی سے جواب دیا "کیا نہ جاؤں۔ اگر زیادہ تکلیف ہے۔ تو تمہارے سرہانے

بیٹھ کر تمہیں پیار کروں ؟"

"نہیں نہیں گرجا نے آہستہ سے کہا " آپ جائیں۔ آج مجھے آرام ہے میرا مطلب صرف یہ تھا۔ کہ آپ رات کو آئینگے۔ یا شیام جی کے ہاں ہی رہیں گے ؟"

میں نے کہا "نہیں دو بجے لوٹ آؤں گا "

گرجا نے جواب دیا " بس پھر ٹھیک ہے "

میں نے کہا " کیا ٹھیک ہے ؟"

گرجا نے منہ پھیر لیا۔ اور کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بیہوش ہوگئی۔ میں نے نوکر کو کہا۔ دوائی حلق میں ٹپکاؤ۔ وہ ادھر ہوا۔ اور میں چھڑی گھماتا ہوا باہر نکل آیا۔

(۵)

پردہ اٹھا۔ تو سورگ کی ہوائیں آنے لگیں۔ حسن کی زندہ تصویریں سامنے تھیں کالی داس نے جو کچھ شکنتلا میں خوبیاں بیان کیں۔ سب اوما میں تھیں۔ وہی نزاکت۔ وہی مستانہ چال۔ وہی رفتار۔ ننھے پانی کا گھڑا لئے خوبصورت پھولوں کے درختوں کو سینچ رہی تھی۔ مجھے اُن پر رشک آیا۔ آہ نہیں بتا سکتا۔ کتنا رشک آیا۔ وہ اُن پر پیار سے پانی ڈال رہی تھی اور وہ خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔

حاضرین پر وجد کا عالم طاری تھا۔ وہ دیکھتے تھے۔ اور سنتے تھے مگر اپنے آپ کو بالکل بھولے ہوئے تھے۔ جتنی نگاہیں تھیں سب کی سب اوما کے چہرے پر تھیں۔ جتنے دل تھے سب کے سب اُسی طرف جھکے ہوئے تھے۔ اوما کا بھولا بھالا چہرہ شکنتلا کے لباس میں چاروں طرف جادو کی لہریں پھینک رہا تھا۔ اور قیامت کا اثر پیدا کر رہا تھا۔ پھر وہ سین آیا۔ جب شکنتلا دشینت کو خط لکھتی ہے۔ ہری ہری گھاس اور ننھے ننھے پھولوں کے اوپر لیٹ کر جب وہ خط لکھنا چاہتی تھی۔ اور قلم کو ہونٹوں پر رکھ کر سوچنے لگتی تھی۔ تو لوگ تڑپ تڑپ جاتے تھے۔ وہ ہنستی تھی۔ اور چاروں طرف ہنسی پھیل جاتی تھی۔ وہ غمگین چہرہ

بتاتی تھی۔ اور ہر طرف اوداسی برسنے لگتی تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا۔ شکنتلا تمام عالم پر حکمرانی کر رہی ہے وہ سچ مچ حکمرانی کرنے کے قابل تھی۔ ہنستی تھی۔ تو پھول گرتے تھے۔ روتی تھی تو موتی بکھرتے تھے۔ سب اُسے چاہتے تھے۔ مگر وہ مجھے ہی چاہتی تھی۔

تماشہ ختم ہؤا۔ اوما اور میں بگھی میں سوار ہوئے وہ مسکرا کر میری طرف دیکھنے لگی اور میں اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ بگھی چلی۔ مگر بلکلحت پھر رُک گئی؛

(۶)

نوکر نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے جلدی سے باہر نکلکر کہا۔" کیا ہے"؟

نوکر نے جوابدیا۔"حضور تار ہے"

میں ہنے کہا۔" تار"

اوما نے بھی کہا۔" تار"؟

چپڑاسی نے کہا۔" ہاں حضور تار ایک آپ کا۔ ایک ان کا"

میں نے تار پڑھا۔ اور میرا رنگ اڑ گیا۔ اوما نے تار پڑھا۔ اور پیلی پڑ گئی۔ اُسے گھبرائے ہوئے دیکھ کر میں اپنا تار بھول گیا۔ اور جلدی سے پوچھا" کیا ہے"؟

اُسوقت اُسی لب ولہجہ سے اوما نے مجھ سے پوچھا" کیا ہے"؟

سوالات کا تبادلہ ہؤا۔ اور ساتھ ہی تاروں کا بھی تبادلہ ہوگیا۔ میرا تار پڑھکر اوما نے ہلکی سی چیخ ماری۔ اور گرنے کو تھی۔ کہ میں نے اُسے سنبھال لیا۔ وہ کانپتے ہوئے بولی "باغیانہ مضمون کا مقدمہ اُوئی۔ یہ تو آسمان سے قہر ٹوٹ پڑا۔ مدن لوح جنم لیتا"

میں نے خوف کو چھپا کر کہا" کوئی پرواہ نہیں۔ مدن نے مجھے تم ایسی نازنین دی ہے مقدمہ چلے گا۔ تو کیا ہوگا۔ مگر ہاں تمہارا تار دیکھوں"۔ لکھا تھا۔

Father died, reach soon,

تمہارا باپ مر گیا ہے۔ فوراً پہنچو۔ میں نے کہا۔ اُف یہ کیا غضب ہؤا۔ ہم دونو پر اکٹھا قہر

اُوما نے رنج وغم کو ضبط کر کے جواب دیا" چلو سیدھے مسٹر شامپسن بیرسٹرایٹ لاء کے ہاں چلیں ہمارے کیس کی پیروی کرے گا"

میں نے کہا" ہوں"

اوما نے جواب دیا" ہوں کا کیا مطلب؟"

میں نے سر جھکا یا" میری طاقت نہیں۔ کہ میں اس کی خدمات حاصل کرسکوں"

اوما بولی۔ میرے لاکھوں روپے کس کام آئینگے۔ اگر تم کو تکلیف ہو۔ تو میری ساری جائداد ساری دولت۔ ساری پونجی تمہارے سر پر سے قربان ہوسکتی ہے"

میں نے احسانمندانہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔ مگر وہ کھڑکی سے سر باہر نکال کر درختوں کی طرف دیکھنے لگی۔ گاڑی چلی۔ اور ہم مسٹر شامپسن کے دروازے پر پہنچ گئے۔ بہروں کو خاص انعام دے کر اُسے اُٹھایا۔ اور تین سو روپے روزانہ پر کیس کی پیروی مسٹر شامپسن کے سپرد ہوگئی۔

گاڑی پھر چلی۔ میں نے کہا" اوما۔ تم نے تو مجھے اپنا بنا لیا۔ میں پہلے تمہاری زندہ دلی اور علم دوستی کا غلام تھا۔ اب اور بھی غلام ہوگیا۔ یہ احسان عمر بھر نہ بھولیگا۔ میں اب محض تمہارا ہوں۔ صبح کو وارنٹ آئیگا۔ تو تمہاری بدولت ضمانت ہو جائیگی۔ ورنہ مجھے قید خانہ میں جانا پڑتا۔ بھلا ہو مسٹر ہریش کا جس نے اطلاع دیدی۔ ورنہ تم صبح سٹیشن پر جاتی۔ مجھے تکالیف ومصائب کا سلسلہ آجاتا۔ اب تو میں محض تمہارا ہوں"

اوما نے کہا" میں تو کبھی کی تمہاری ہوچکی ہوں" یہ کہکر اُس نے اپنے آپ کو میری بانہوں میں گرا دیا۔ میں نے اُسے زور سے گلے لگا لیا۔ اور اُس کے خوبصورت منہ کو چومنے کی خواہش کی۔ چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ چاند کی کرنیں جو شیشوں سے پھوٹ پھوٹ کر اندر آرہی تھیں۔ نہ معلوم کہاں گئیں۔ ایک آواز آئی۔ بھولے شیام اگر جا کو نہ بھول یہ حق اُس کا ہے آواز کا آنا تھا۔ کہ گرجا کے ساتھ شادی کا پہلا سال آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔

آہ! وہ دن کیسے عجیب تھے۔ جب چاروں طرف مسرت ہی مسرت تھی۔ گرجا کی سچی محبت سچی عقیدت اور سچی شردھا میرے دل میں اُتر آئی۔ میرے دل میں نور چمکا۔ اور میں نے اوما کو علیحدہ کر دیا۔ اسی وقت گاڑی ٹھہر گئی۔ اور میرا مکان آگیا۔ میں نے اوما سے اجازت لی۔ اور اندر چلا۔ میں اب وُہ نہ تھا جو جاتے وقت تھا۔ زمین آسمان کا فرق پڑ چکا تھا۔

(۷)

لپکا لپکا میں اندر گیا۔ اور اُس کمرے میں داخل ہؤا۔ جہاں گرجا اپنی بدبختی کے دن پورے کر رہی تھی۔ مگر وہاں پہنچتے ہی میرے دل پر چوٹ لگی۔ گرجا مر چکی تھی۔ اور نبض حرکت نہ کرتی تھی میں نے اُسے بلایا۔ اور بار بار بُلایا۔ مگر جب متواتر آوازوں کا جواب نہ ملا۔ تو بیہوش ہو کر پاس ہی گر گیا۔

ہوش آئی۔ تو گرجا میرے سینے سے لپٹی ہوئی مجھے چوم رہی تھی۔ میں چلا اٹھا "گرجا گرجا کیا تو زندہ ہے؟" گرجا رو پڑی۔ اور بولی "ہاں پران ناتھ میں زندہ ہوں"!

میں نے اُسے ساری کہانی سنائی۔ اور معذرت کی۔ تو اُس نے ہنسکر کہا۔ وہ آواز پرماتما کی آواز تھی میں نے کہا "وہ آواز پرماتما کی آواز تھی"!

میرا ننھا بھائی اندر ہنستا ہؤا داخل ہؤا اور ہماری نقل کر کے کہنے لگا "وہ آواز پرماتما کی آواز تھی"!

رات گذر چکی تھی۔ دن چڑھ چکا تھا۔ میں باہر آیا۔ اور سپاہیوں کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔

(۸)

اوما کے مقرر کردہ بیرسٹر ایٹ لاء سے مدد لینے سے میں نے انکار کر دیا۔ اور اُس نے اُسے تار دے دی۔ نتیجہ یہ ہؤا۔ کہ چوتھے دن اوما کلکتے پہنچ گئی۔ میں حراست میں تھا۔ اور مجھے ملنے کی کسی کو اجازت نہ تھی۔ اوما نے وکیل کی معرفت مجھ سے سوال کیا۔ کہ میں مدد لینے سے انکار کیوں کرتا ہوں۔ میرا جواب محض یہ تھا۔ کہ میں کسی دوسری عورت سے مدد لینا نہیں چاہتا۔

اس کے بعد اوما نے دوسرا سوال نہیں کیا۔
مجھے کافی آمدنی تھی۔ اور بارش کی طرح روپیہ آتا تھا۔ مگر جاتا بھی پانی کی طرح تھا۔ ٹھاٹ باٹ شاہانہ رہا کرتا تھا۔ لیکن گھر میں جمع کچھ نہ رہتا تھا۔ اسوقت میرے پاس صرف چند سو روپیہ تھا۔ اور بس۔
مقدمہ پیش ہونے کے ساتھ ہی شہر کی پبلک نے چندہ اکٹھا کر کے میری طرف سے وکیل کھڑا کر دیا۔ مقدمہ معرکہ کا تھا۔ میرے مضمون کے حرف حرف پر بحث ہوئی لفظ لفظ پر وکیلوں کا جھگڑا ہوا۔ ایک ماہ کی قید کے بعد مجھے باعزت بری کر دیا گیا۔ یہ سب میرے وکیل کی مہربانی تھی
اب اوما سوویلیٹی ازم کی پرچارک بن گئی ہے۔ اور مجھ سے اور گرجا سے وہی محبت ہے جو پہلے تھی۔ اب جب کبھی ہم اکٹھے بیٹھتے ہیں۔ اور اُس آزمائش والی رات کا تذکرہ آجاتا ہے تو ہم دونوں کے منھ سے بے اختیار نکل جاتا ہے۔
وُہ آواز پرماتما کی آواز تھی



رنج وراحت

ـــــ ۱۸ ـــــ

"میں مر رہا ہوں میرا دم گھٹ رہا ہے۔ میری آنکھوں کی پتلیاں پھر رہی ہیں۔ میری ٹانگیں سکڑ رہی ہیں۔ میرا سر چکر کھا رہا ہے میرا کلیجہ پھٹ رہا ہے۔ دل سینے سے نکلا جاتا ہے آہ! میں مرا۔ کرشن! کرشن!! پانی لاؤ۔ جلدی کرو میرا دم بند ہونے کو ہے۔"

یہ الفاظ بوڑھے تلسی کے منہ سے نکلے۔ جب وہ درخت کے سائے تلے چٹائی پر پڑا ہوا دم توڑ رہا تھا۔ کرشن پر وہ گو ہزار ظلم کرتا تھا۔ لاکھ سختی برتتا تھا۔ مگر تاہم اُس کا باپ تھا۔ کرشن کو اس سے کچھ محبت تو نہ تھی۔ لیکن اس کا کہنا ضرور ماننا کرتا تھا۔ اب جب کہ وہ آخری دموں پر تھا۔

کرشن دوڑا۔ اور جلدی جلدی پانی کا ڈول نکال کر قریب المرگ باپ کے نزدیک آکر پانی کے چند قطرے اُس کے منہ میں ٹپکائے۔ سادھو نے آنکھیں کھولدیں اور ٹھنڈا سانس بھر کر کہا میں نے بڑے پاپ کئے ہیں۔ میں بڑا پاپی ہوں۔ اب مجھے موت سے ڈر آتا ہے! خوف آتا ہے اور بھے آتا ہے۔ وہ خوش قسمت لوگ ہوتے ہیں۔ جو جلدی مر جاتے ہیں۔ مگر وہ موت دھرماتماؤں کے لئے ہے! نیک پرشوں کے لئے ہے۔ اور شریف اشخاص کے لئے ہے! بدمعاشوں کے لئے چوروں کے لئے! اور ڈاکوؤں کے لئے تڑپنا ہے۔ کراہنا ہے۔ اور دانت پیسنا ہے! شانتی کی موت آہ شانتی کی موت کاش مجھے ملتی۔ میرے حصے میں آتی۔ م۔۔۔۔م۔۔۔۔ میرا۔۔۔۔د۔۔۔۔د۔۔۔۔۔۔دم"

کرشن کا دل دھڑکا۔ اور پیشانی پر پسینے کے قطرے آگئے۔ اُس نے آگے بڑھ کر پھر پانی

کی بوندیں اُس کے مُنہ میں ٹپکائیں۔ بڈھے سادھو نے پھر زبان کھولی۔ اور کہنا شروع کیا
"پیارے کرشن! تم مجھے معاف کر دو! کشما کر دو۔ پرماتما کے لئے میرا قصور بخشدو۔ میں
نے گناہ کیا۔ اور سخت گناہ کیا۔ ایسا گناہ بخشا نہیں جاتا۔ قدرت مجھے ضرور سزا دے گی۔ اگر
تُم بخشدو۔ تو میرے سر سے ایک بوجھ اتر جائیگا۔ اور دل ہلکا ہو جائیگا۔ کرشن تم پر میں نے
ظلم کیا! اتیاچار کیا! اور بے انصافی کی! کیا تُم مجھے نہ بخشوگے؟"

کرشن زار زار رو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں خون کبوتر کی طرح سُرخ تھیں۔ اُس نے
اپنا سر بڈھے جوگی کے قدموں میں رکھدیا۔ اور کہا "پتا! آپ نے مجھ پر کوئی ظلم نہیں کیا آپ
میرے والد ہیں۔ اور میں آپ کا بیٹا ہوں! آپ کا مجھ پر حق تھا! اور ہے اگر آپ نے مجھے
کبھی جھڑکدیا۔ یا تھپڑ دے مارا تو یہ معمولی بات ہے۔ میں نے آپ سے بہت دفعہ گستاخی
کی ہے۔ اس کے لئے آپ مجھے کشما کریں مگر آپ تو راضی ہو جائینگے"

بڈھے جوگی نے پھر اشارہ کیا۔ کہ پانی کے قطرے مُنہ میں ٹپکا دو۔ کرشن نے چند قطرے
ٹپکا دیئے۔ اور جوگی نے کہا!

"کرشن! میں تمہارا باپ نہیں ہوں۔ میں نے تمہیں چرا لیا تھا۔ تمہارا باپ بڑا امیر ہے
اس کا نام ...... ہر ...... ہر ...... ہر"

یہ الفاظ کہتے کہتے اس کی زبان رُک گئی۔ کرشن نے سمجھا میں خواب دیکھ رہا ہوں
وہ آگے بڑھا۔ مگر وُہ چڑیا جو بولتی تھی۔ جو سُنتی تھی۔ جو دیکھتی تھی اُڑ چکی تھی۔ اور پنجرا خالی
رہ گیا تھا۔ کرشن نے چاروں طرف دیکھا۔ اور حیران رہ گیا۔

—— ۲ ——

کرشن اب اکیلا تھا۔ اُس کا کوئی دوست نہ تھا۔ کوئی یار نہ تھا۔ دُنیا فراخ تھی۔ مگر کرشن
کے لئے تنگ تھی۔ اور تاریک تھی۔ رات کے وقت تاریکی میں، لمبے لمبے درختوں کے درمیان
وہ گھومتا رہتا تھا۔ وہ خواہش کرتا تھا۔ کہ میرا بھی کوئی پتا ہو۔ وہ عموماً سوتے وقت بڑبڑایا

کرتا تھا کہ وہ بچے کیسے مبارک ہیں جن کے سروں پر والدین کا سایہ ہے۔ اور جن کو بیٹنے کیلئے ماں کی گود ہی کھلی رہتی ہے مگر اس کی خواہش کچھ نہ کر سکتی تھی۔

سخت ترین سزا جو دی جا سکتی ہے۔ قید تنہائی کی سزا ہے۔ نہ کسی سے بولو۔ اور نہ کسی کو دیکھو پر ما تما نہ کرے یہ حکم کسی کو دیا جائے انسان ملنے جلنے والا حیوان ہے۔ اور اس سے زیادہ سزا کسی کو کیا دی جا سکتی ہے۔ کہ اس سے اس کی ذاتی صفت کو چھین لیا جائے یہ سزا تھی۔ جو کرشن آپ سے آپ جھیل رہا تھا۔ وہ جنگل میں رہتا تھا۔ اور جنگل میں ہی گھومتا تھا جنگل اُس کا گھر جنگل اس کا مکان تھا جنگل اُس کی ماتا جنگل اُس کا پتا تھا جنگل اُس کا یار جنگل اُس کا دوست تھا جنگل اُس کا ساتھی جنگل اُس کا رفیق تھا جنگل اُس کا اوڑھنا جنگل اُسکا بچھونا تھا۔ جنگل اُس کا کھانا جنگل اُسکا پینا تھا جنگل اُس کی زمین جنگل اس کا آسمان تھا۔ اُس کے لئے سب کچھ جنگل تھا جب سے تلسی مرا تھا۔ وہ جنگل سے باہر نہیں گیا۔ وہ بن واسی بن تھا جو بن کے پرندوں اور چرندوں سے کھیلا کرتا تھا۔ پھل کھا کر ندی کا پانی پیا کرتا تھا۔ اور درختوں کے لئے میں گھاس کے بچھونے پر رات کے وقت سو جایا کرتا تھا۔

صبح ہوتی تھی شام ہوتی تھی۔ عمر یونہی تمام ہوتی تھی

— ۳ —

"اسے پکڑ لو۔ جانے نہ دو۔"

یہ آواز ایک سوار کے مُنھ سے نکلی۔ اور بن میں گونجنے لگی۔ گھوڑوں کی ٹاپوں سے زمین کانپ اُٹھی۔ اور چشم زدن میں پچیس کے قریب گھڑ سوار غریب کرشن کے گرد آ کھڑے ہوئے وہ جلدی سے اُٹھا۔ اور اتنے سواروں کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ اس نے آنکھیں ملیں، اُس نے ہونٹ کھولے، اور مُنہ میں اُنگلی دبائی۔ وہ جاننا چاہتا تھا۔ کہ یہ خواب ہے۔ یا بیداری ہے اتنے میں ایک سوار گھوڑے سے کودا۔ اور کہنے لگا "تمہارے پاس جو کچھ ہے، رکھدو۔ اور چُپ چاپ ہمارے ساتھ چلے چلو۔ ورنہ نتیجہ خراب ہوگا۔"

کرشن نے خوف سے کانپ کر جواب دیا "میں غریب ہوں۔ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ مجھے چھوڑ دو۔"
سوار نے اُسے جھڑک کر کہا "اگر تمہارے پاس کچھ نہیں۔ تو نہ سہی ہم تمہیں کھا تو نہیں جاتے۔ چلو ہمارے ساتھ چلو۔ ہمارا سردار بڑا اچھا آدمی ہے۔ وہ کسی پر ظلم نہیں کیا کرتا۔"
کرشن نے ایک دفعہ پھر گڑگڑا کر عرض کی جو سختی، ترشی، اور گالیوں کے ساتھ نامنظور کی گئی۔ اُسے ایک گھوڑے کے ساتھ کس کر باندھ دیا گیا۔ اور سواروں نے گھوڑوں کو ایڑ دی۔ گھوڑے اُڑے اور ہوا سے باتیں کرنے لگیں۔ دن گذرا۔ اور رات بھی گذر گئی۔ مگر سفر ختم نہ ہوا۔ آخر دس بجے کے قریب ایک غار میں اُن کا سفر ختم ہو گیا۔ کرشن کو سردار کے سامنے پیش کیا گیا۔
سردار "تمہارا نام کیا ہے؟"
کرشن "جناب غلام کا نام کرشن ہے۔"
سردار "تمہارے پاس کچھ زیور ہیں۔"
کرشن "حضور میرے پاس کوئی زیور نہیں۔ میں جھوٹ نہیں بولتا۔ سچ کہہ رہا ہوں۔"
سردار "تم کس کے بیٹے ہو؟"
اب وہ مشکل میں پڑ گیا۔ اس نے سوچا کہ اگر میں کہدوں گا۔ کہ ایک امیر کا بیٹا ہوں۔ اور باپ کا نام مجھے معلوم نہیں۔ تو یہ ڈاکو مانیگا نہیں۔ اور تکلیف دیگا۔ اس لئے۔
کرشن نے کہا "حضور! میں ایک سادھو تلسی کا بیٹا ہوں۔ وہ مر گیا ہے۔ اور میں یتیم ہوں۔"
سردار۔ کچھ دیر تک کرشن کے چہرے کو تاکتا رہا۔ پھر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر نوکر سے بولا۔ "اسے لے جاؤ۔ اور میرے کمرے کے ساتھ کے کمرے میں اسے خاطر سے رکھو۔ کوئی تکلیف نہ ہونے دو۔"
دن بھی آرام سے گذرا۔ اور رات بھی آرام سے گذر گئی۔ دوسرے دن کرشن کو سردار نے

اپنے پاس بٹھالیا۔ اور محبت بھرے الفاظ میں اُس سے اس کے باپ کے حالات پوچھنے لگا
کرشن نے کچھ اس طرح کے درد انگیز پیرائے میں اپنے باپ کی جو در اصل باپ نہیں تھا۔
موت کا ذکر کیا۔ کہ سردار کی رہ رہ کر ہچکی بندھ گئی۔ کرشن متعجب ہو رہا تھا۔ کہ کیا یہ ڈاکو جو
ڈاکوؤں کا سرتاج ہے۔ ایسا نرم دل ہو سکتا ہے۔ پھر اس سوال نے پہلو بدلا، اور اس شکل
میں ظاہر ہوا۔ کہ کیا ایسا نرم دل شخص جو مجھ جیسے کمزور لڑکے سے اس طرح سلوک کرتا ہے اور
میری حکایت سُنکر اس طرح رو رہا ہے۔ ظالم اور بے ترس ہو سکتا ہے۔ دل نے کہا۔ اور سردار
کے چہرے نے اس کی تائید کی۔ کہ یہ ناممکن سی بات ہے۔ وہ ابھی رو ہی رہا تھا۔ کہ ایک
سوار کمرے میں داخل ہوا اور کہنے لگا "حضور ایک آدمی اور حاضر ہے"
سردار نے آنسو پونچھ ڈالے۔ رومال سے چہرہ صاف کیا۔ اور کہا۔ "اُسے لے آؤ"
تھوڑی سی دیر کے بعد ایک لڑکا جس کی عمر کرشن جتنی ہی چودہ پندرہ سال کی ہوگی
کمرے میں داخل ہوا۔ اُسکا چہرہ بشاش تھا۔ اور اس سے چالاکی اور ہوشیاری ٹپکتی تھی؛
سردار "تمہارا کیا نام ہے؟"
لڑکا "میرا نام شام داس ہے"
سردار "تمہارے پاس کوئی زیور ہے؟"
شام داس "ہاں جناب! آپ کے آدمیوں نے لے لئے ہیں"
سردار "تمہارے باپ کا کیا نام ہے؟"
شام داس "حضور یہ باتیں خلوت میں بتائی جا سکتی ہیں"
سردار نے کرشن کی طرف دیکھا۔ وہ سمجھ گیا۔ اور اُٹھ کر اپنے کمرے کی طرف روانہ ہوا۔
تھوڑی ہی دیر کے بعد غار خوشی کے نعروں سے گونج اُٹھی۔ کرشن نے پوچھا۔ اور ایک
سوار نے بتلایا۔ کہ سردار صاحب کا لڑکا مدت سے کھو گیا تھا۔ وہ اسی کی تلاش میں گھومتے
رہتے تھے۔ خوشی کا سبب اُس لڑکے کا ملنا ہے۔ جسکا نام شام داس ہے۔ سوار نے کہا۔ کہ

آج رات کو بڑی دھوم دھام سے جلسہ ہوگا۔ جسمیں سب کو دعوت دی جائیگی۔ گانا بجانا ہوگا۔ اور لڑکے کو سب سواروں سے انٹروڈیوس کرایا جائیگا۔ کرشن نے سردار کو جا کر مبارکباد دی جس نے اُسے گلے سے لگالیا۔ اور کہا تم بھی میرے دوسرے بیٹے کی طرح رہوگے۔ میں تمہیں دوسرا شام داس سمجھوں گا۔ کرشن نے یہ سُنا۔ اور عزت اور محبت سے سر جھکا دیا۔

۴۶

ڈاکوؤں کا سردار اُسدن سے کرشن کو بہت پیار کرنے لگا۔ اسے شام داس سے محبت تھی۔ کیونکہ وہ اسکا لڑکا تھا۔ مگر کرشن کی محبت اس کے دل سے، دماغ سے، جان اور جسم سے پھُوٹ پھُوٹ کر نکلتی تھی۔ اُس نے ایک بار نہیں کئی بار کہا اور آدمیوں کے درمیان بیٹھے ہوئے کہا کہ مجھے کرشن سے اتنی ہی محبت ہے جتنی کہ شامداس سے ہے۔ وہ کہتا تھا۔ کہ میں مجبو ہوں اس کی شکل میرے دل میں کھب گئی ہے۔ وہ جب ایک گھنٹہ شام داس کو نہ دیکھتا۔ تو گھبرا جاتا۔ مگر کرشن کو آدھ گھنٹے کے لئے بھی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیتا۔

کرشن یہ سب کچھ جانتا تھا۔ اور سمجھتا تھا۔ اس نے نہ صرف سردار کی محبت کو دل میں جگہ دی۔ بلکہ شامداس سے بھی بھائیوں کی سی محبت کرنے لگا۔ جب کبھی شامداس اس سے ناراض ہو جاتا۔ اور زور سے کڑک کر بولتا۔ تو کرشن سر نیچا کر کے خاموش ہو جاتا۔ اور کہتا "میں آپ کا تابعدار غلام ہوں"

ایک دن دونوں بھائی باہر سیر کو نکلے۔ شام داس ایک جھونپڑی کو دیکھ کر ٹھہر گیا اور کرشن سے معذرت کی۔ کہ "مجھے کچھ کام ہے۔ اس لئے معافی چاہتا ہوں"

کرشن نے کہا۔ مضائقہ نہیں۔ اور آگے نکل گیا۔ شام داس نے جھونپڑی کے دروازے پر اپنا ایک نوکر دیکھا۔ اور اُسے بغیر کچھ کہے دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ جہاں ایک چودہ سالہ خوبصورت لڑکی فرش پر بیٹھی رو رہی تھی۔ اُس نے شام داس کو دیکھا۔ اور کانپ کر رہ گئی۔ شامداس نے پوچھا۔ "چندراوتی۔ بتلاؤ۔ اب کیا ارادہ ہے؟"

چندراوتی نے رو کر کہا "پرماتما کے لئے مجھے تنگ نہ کرو۔ میں بدنصیب ہوں، بدبخت ہوں اور مصیبت زدہ ہوں۔ میرے حال پر رحم کرو۔ اور مجھے چھوڑ دو، آزاد کر دو۔ جانے دو"
شام داس "کہاں جانے دوں؟ کیسے چھوڑ دوں؟ کس طرح آزاد کر دوں؟ میرا حال دیکھو اور مجھ پر رحم کرو۔ میں تمہارے ساتھ زندگی بسر کرنے کا خواہشمند ہوں۔ کیا یہ پاپ ہے، گناہ ہے۔ یا جرم ہے"
چندراوتی "جب میری خواہش نہیں ہے تو آپ کا مجبور کرنا ظلم بھی ہے، قہر بھی ہے، پاپ بھی ہے۔ اور جرم بھی ہے"
شام داس "دیکھو پچھتاؤ گی"
چندراوتی "ہرگز نہیں"
شام داس "مان جاؤ"
چندراوتی "کبھی نہیں"
شام داس "میں ظالم ہوں"
چندراوتی "مظلوم ہونا برکت ہے..... اتنے میں دروازہ کھلا اور کرشن اندر داخل ہوا۔ شامداس نے اُسے دیکھا۔ اور غصہ سے لال ہو گیا۔ دروازہ ایک دفعہ پھر کھلا اور سردار اور ایک سادھو اندر داخل ہوئے۔ سادھو کو دیکھتے ہی شامداس گھبرا گیا۔

سردار نے چندر زیور کرشن کو دکھا کر کہا "کبھی آپ نے دیکھے ہیں؟"

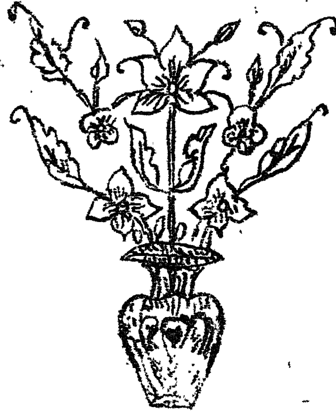
کرشن نے کہا "ہاں یہ سادھو تلسی کے پاس تھے"

سادھو نے کہا "لالہ ہرجی مل! یہ لڑکی آپ کی بیٹی چندراوتی ہے۔ یہ کرشن آپ کا لڑکا ہے۔ اور یہ بدمعاش کون ہے؟ میں نہیں جانتا"

چندراوتی نے کہا "میرا باپ ڈاکو ہے۔ کبھی نہیں ہو سکتا"

ہرجی مل نے کہا "میں ڈاکو نہیں صرف تم دونوں کو تلاش کرتا تھا۔ اور آج میری محنت

سپھل ہو گئی ہے" چندراوتی اور کرشن دونو برجی لال سے لپٹ گئے۔ اسوقت اُن کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ یہ آنسو خوشی کے تھے، اور ملاپ کے تھے! چندراوتی اور کرشن کی سفارش پر بدمعاش شام داس کو بغیر کچھ کہے کے چھوڑ دیا گیا"



پرماتما کے حضور میں

"ظالم، بیرحم آسمان! اب رحم کر۔ دیکھ دیکھ میرا حال زار دیکھ! سن سن میری غم بھری کہانی سن۔ میں پہننے کو ریشم اور مخمل کے کپڑے نہیں مانگتی۔ صرف موٹے چھوٹے میلے، پرانے کپڑوں کی خواہش ہے۔ کیا یہ خواہش بھی ناجائز ہے؟ کیا یہ مطالبہ بھی اونچی چھلانگ ہے؟ رہنے کو مکان میں نہیں چاہتی۔ سر جھکانے کو جگہ میں نہیں چاہتی۔ زمین میری چارپائی اور آسمان میری چھت ہے۔ سورج میری انگیٹھی اور چاند میرا لمپ ہے۔ گھاس میرا فرش اور ہوا میرا پنکھا ہے۔ گرمی کے دنوں میں، تپش کے موسم میں، میں شہر سے باہر درختوں کے نیچے سڑک پر سو رہوں گی۔ سردی کے ایام میں کڑکڑانے والے اور خون کو منجمد کرنے والے موسم میں، میں پیارے ننھے موہن کو چھاتی سے چمٹا کر حلوائیوں کی بھٹی میں، جہاں کی راکھ گرم ہوتی ہے۔ آرام سے سو رہوں گی۔ میرے لب پر شکوہ نہ ہوگا۔ میری زبان پر شکایت نہ ہوگی۔ مجھے اچھے اچھے میٹھے میٹھے، ذائقے دار کھانوں کی۔ اچھا نہیں ہے۔ مگر سوکھی سڑی، بدمزہ اور باسی روٹی تو مل جائے۔ اور فاقہ کی نوبت نہ پہنچے۔ میری آنکھوں کا تارا جگر کا ٹکڑا موہن بھوکا نہ تڑپے یہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔ جب وہ اوس پڑوس سے، منتیں کر کر کے، کتنے عرصہ کے بعد پڑھ کر آتا ہے اور کچھ کھانے کو مانگتا ہے۔ تو میرے کلیجے پر برچھیاں چل جاتی ہیں۔ آج بھی مجھے اجرت نہیں ملی۔ کام کر کر کے گھائل ہو گئی۔ اور پیسوں کے لئے تاریخ پڑ گئی۔ موہن آئیگا اور کھانے کو مانگیگا۔ تو کیا دوں گی؟

ظالم فلک! میں بھوکی رہ سکتی ہوں مگر بچہ بھوکا نہیں رہ سکتا۔ اس پر تو رحم کی نظر کر۔"

یہ الفاظ بوڑھی عورت کی زبان پر تھے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اور چہرے کا رنگ

کپاس کے پھولوں کی طرح پیلا پڑ گیا تھا۔ وہ بار بار دروازے کی طرف دیکھتی تھی۔ اور ٹھنڈی سانسیں بھرتی تھی۔ اتنے میں اس نے دیکھا۔ کہ دور سے ایک دس برس کا بچہ ہاتھ میں پھٹی ہوئی کتاب پکڑے خوش خوش چلا آتا ہے۔ وہ اچھلتا تھا۔ اور کودتا تھا جھومتا تھا۔ اور چھلانگیں لگاتا تھا۔ اس کے چہرے سے مسرت ٹپکتی تھی اور آنکھوں سے خوشی کی بارش ہوتی تھی یہ بچہ اسی بڑھیا کا لڑکا موہن تھا۔ بڑھیا اسے دیکھ کر پہلے خوش ہوئی۔ مگر پھر کوئی خیال اسکے دل میں آیا۔ اور اس کے چہرے پر رنج کے آثار نمایاں ہوئے۔ دوسرا خیال روٹی کا خیال تھا۔



"ماں! آج میں روٹی نہیں کھاؤں گا۔"

مسکراتے ہوئے موہن نے دہلیز پر پاؤں رکھتے ہی کہا۔ اور کتاب کو ایک پتھر پر رکھکر بولا "آج میں نے ایک نئی چیز کھائی ہے۔ اس کا بڑا مزہ آیا۔ اب میں وہ کھایا کروں گا کیوں ماں! تو مجھے دیا کرے گی نہ۔"

بڑھیا نے پوچھا "موہن! تم نے آج کیا کھایا ہے؟"

موہن نے زبان کو لبوں پر پھیرا۔ اور کہا "آج میں نے پیڑے کھائے ہیں۔ ان کا بڑا مزا تھا؛ بڑا اچھا ذائقہ تھا۔ بابو کہتا تھا۔ یہ بڑے سستے ہیں۔ اب تو اب پیڑے ہی کھایا کروں گا۔"

یہ الفاظ سن کر بڑھیا بیتاب ہو گئی۔ اس کا دل پسیجا اور دل سے غبار سا نکلا غبار نے اور راہ نہ دیکھ کر آنکھوں کا راستہ لیا۔ آنکھوں کی راہ سے یہ غبار آنسوؤں کی شکل میں باہر نکلا وہ کچھ دیر روئی۔ اور پھر آگے بڑھ کر اس نے بیٹے کو کھینچکر بڑے زور سے گلے سے لگا لیا۔ روتے روتے اس نے کہا "بیٹا! کبھی تو اچھے دن آئیں گے ہی نہ۔"

موہن نے پوچھا "اچھے دن کس جگہ سے آئینگے۔ آج کل وہ کہاں ہیں؟ بتا جلدی بتا۔"

اس سوال کا جواب بڑھیا نہ دے سکی۔ اور خاموش رہی۔

موہن نے پوچھا "اچھا ماں، بابو کو تو بڑے اس کا پتا لا کر دیتا ہے۔ ہمارا پتا کہاں ہے؟ وہ ہمیں بڑے کیوں نہیں لا کر دیتا؟"

بھولے بھالے بچے کا یہ سیدھا سادھا سوال سنکر بڑھیا تڑپ گئی۔ اُسے وہ زمانہ یاد آ گیا۔ جب اس کا شوہر جیتا تھا۔ اس نے تصور ہی تصور میں اپنا شوہر خوبصورت کپڑوں میں دیکھا پھر اُسے وہ وقت یاد آیا۔ جب اڑوسیوں پڑوسیوں نے اُس کا سب کچھ لوٹ لیا تھا۔ اور پھر اُسے یہ وقت یاد آیا جبکہ وہ ایک پرائے مکان میں رہتی ہے۔ بھر گئے۔ اس کی آنکھوں میں وہ بیل و نہار جب وہ گاڑی میں چڑھ کر بازار سے گذرا کرتی تھی۔ اور جب اُس کو پھولوں کا ہار پہننا بھی بار خاطر ہوا کرتا تھا۔ کھنچ گیا وہ نقشہ اس کے سامنے۔ جب چار برس کے موہن کو سرہانے پر جگہ ملتی تھی۔ اور وہ ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔ یاد آیا غریب کو وہ زمانہ جب وہ چار منزلی مکان میں رہا کرتی تھی۔ ان سب باتوں نے اس کی ہچکی بندھوا دی۔ وہ رونے لگی۔ اور زار زار رونے لگی

موہن نے پوچھا "ماں! تو روتی کیوں ہے؟"

بڑھیا نے بچے کو رلانا مناسب نہ سمجھا۔ اور آنسو پونچھکر اپنے بیٹے کے گالوں کو چوم کر بولی "بیٹا میں نہیں روتی"

موہن نے پوچھا "پھر بتا میرا پتا کہاں ہے؟"

بڑھیا نے اُنگلی آسمان کی طرف اُٹھا دی۔

موہن نے کہا۔ "آسمان پر؟"

"سورگ پوری میں"

"اس کا نام کیا ہے؟"

"اس کا نام پرماتما ہے"

"وہ میری بات مانیگا؟"

"ہاں مانے گا"

موہن اچھل پڑا اور بولا" تب مجھے پیڑے بھی ضرور ملینگے"

(۳)

اسدن موہن نے روٹی کے لئے ماں کو تنگ نہیں کیا۔ وہ پتھر پر بیٹھا رہا۔ اور چپ چاپ دل ہی دل میں کچھ سوچتا رہا۔ ماں نے ایک دو دفعہ اُسے بلایا۔ مگر اُس نے جواب نہ دیا آخر ماں کہیں سے اس کے لئے روٹی لانے کو باہر چلی گئی۔ وہ تب بھی بیٹھا رہا۔

پندرہ۔۔۔۔ بیس۔۔۔۔ تیس منٹ گذر گئے۔ مگر موہن اُسی طرح بیٹھا رہا۔ اور اسی طرح سوچتا رہا۔ آخر اس نے کتاب کھولی۔ اس میں سے ایک کاغذ نکالا۔ قلم دوات پکڑی اور لکھنے لگا"

میرے پتا شری پرماتما جی

آپ کے چرنوں میں پرنام

ترلوک کا پتا ترلوک کو روز کھلونے لاکے دیتا ہے۔ ہری کا پتا اسے خوبصورت خوبصورت کپڑے پہناتا ہے۔ مگر آپ مجھے کچھ بھی نہیں دیتے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ ماں کہا کرتی ہے" کہ جو بچے شرارتیں کرتے ہیں۔ ان کے ماں باپ اُن سے خفا ہو جاتے ہیں۔ کیا میں نے کوئی شرارت تو نہیں کی۔ جسنے آپ کو مجھ سے ناراض کر دیا ہے۔ پتا جی! اگر ایسی بات ہو! تو بتا دو۔ میں پھر کبھی بھی نہ کروں گا۔ میں تو شریف لڑکا ہوں۔ آپ تو کبھی آکر مجھ سے پیار بھی نہیں کرتے کنشو کا پتا اسے روز پیار کرتا ہے!

اچھا یہ سنو آج میں نے ایک بابو سے پیڑے کھائے ہیں۔ مجھے وہ بڑے پسند ہیں۔ میں روز وہ پیڑے کھایا کروں گا۔ ماں کہتی ہے میرے پاس پیسے نہیں ہیں اور کہتی ہے تمہارے پتا کے پاس ہیں۔ اب آپ کو میں کہتا ہوں۔ کہ آپ ضرور مجھے پیڑے بھیجدیا کریں۔ میرا بڑا دل کرتا ہے۔ کھا کر خوش ہوا کروں گا۔

آپ کا پیارا بیٹا

موہن

یہ چٹھی لکھ کر اور اس پر پورا پتہ لکھ کر موہن اُسے لیٹر بکس میں ڈالنے کو باہر نکلا۔ وہ بڑے فخر سے چاروں طرف دیکھنے لگا اور دیکھ دیکھ کر مسکرانے لگا۔ کیونکہ اُسے یقین تھا۔ کہ اب مجھے باپ رونے پیٹنے سے بچا کرے گا۔

۴

شام کا وقت تھا۔ جب بمبئی کا مشہور سیٹھ رامداس اپنی بگھی میں سیر کرنے کو باہر نکلا جب بگھی ایک چھوٹی سی تنگ گلی کے آگے سے گذرنے لگی۔ اس نے دیکھا کہ ایک چھوٹا سا بھولا بھالا لڑکا ایک لیٹر بکس میں لفافہ ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ لڑکا چھوٹا ہے اور لیٹر بکس کا منہ اونچا ہے۔ لڑکا اچھلتا ہے، ایڑیوں کے بل کھڑا ہوتا ہے۔ ہزار کوشش کرتا ہے۔ لاکھ سر ٹپکتا ہے۔ مگر ہاتھ لیٹر بکس کے منہ تک نہیں پہنچتا۔ سیٹھ رامداس نے بگھی کھڑی کر لی۔ اور نوکر کو کہا۔ جا کر اس لڑکے کا لفافہ لیٹر بکس میں ڈال آؤ۔ بیچارہ تکلیف میں ہے۔ نوکر گیا۔ اور لفافہ ہاتھ میں لے کر ہنستا ہوا آیا۔ اور سیٹھ کے آگے رکھ دیا۔ سیٹھ نے پتہ دیکھا۔ لکھا تھا۔

شری پرماتما کے حضور میں

مقام سورگ پوری

سیٹھ نے لڑکے کو پاس بلا کر کہا۔ "تم کون ہو؟"

"میں موہن ہوں"

"کس کے لڑکے ہو؟"

"میرے پتا کا نام پرمانند ہے۔ میں اُس کا لڑکا ہوں"

سیٹھ یہ سُن کر اور چند لمحوں کے لئے خاموش رہا۔ پھر اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اُس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ پھر اُس نے زمین کی طرف دیکھا۔ اور پھر لڑکے کی طرف دیکھا۔ جیب سے پنسل نکالی۔ اور اگلا پتہ کاٹ کر انگریزی میں اپنا پتہ لکھ دیا۔ نوکر گیا۔ لفافہ لیٹر بکس میں ڈال آیا۔ موہن بھی گیا۔ سیٹھ نے اشارہ کیا۔ نوکر اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ اور اس کا گھر دیکھ آیا

۵

رات کے دس بجے ہیں۔ سیٹھ رام داس اپنی دلھن کی طرح آراستہ بیٹھک میں بیٹھا ہے۔ اسکی آنکھیں ایک لفافہ پر ہیں۔ وہ اُسے پڑھتا ہے۔ اور زار زار روتا ہے پھر پڑھتا ہے۔ اور پھر روتا ہے۔ ایک۔ ۔ ۔ دو۔ ۔ ۔ تین گھنٹے گذر جاتے ہیں۔ مگر سیٹھ اسی طرح لیمپ کے سامنے بیٹھا اسی لفافے کو پڑھ رہا ہے۔ لفافہ کئی دفعہ ختم ہوچکا ہے۔ مگر سیٹھ کا دل سیر نہیں ہوتا وہ اسے پڑھتا ہے اور بار بار پڑھتا ہے۔ پڑھتا ہے۔ اور زار زار روتا ہے اس کی ہچکی بندھی ہوئی تھی۔ اور آنکھیں بیر بہوٹی کی طرح سُرخ ہو رہی تھیں۔ آخر اُس نے رومال پکڑا۔ آنکھیں پونچھیں، منہ صاف کیا اور گھنٹی بجائی۔ ایک نوکر آنکھیں ملتا ہوا کمرے میں داخل ہوا سیٹھ نے اُسے آہستہ سے کچھ کہا۔ اور چارپائی پر دراز ہو گیا۔ اس رات سیٹھ نیند میں ٹھنڈی سانسیں بھرا کیا۔

۶

اوپر کے واقعہ کو پورا ایک سال گذر گیا۔ اب موہن وہ موہن نہیں ہے اور نہ ہی اُسکی ماں وہ بڑھیا ہے۔ جسے غریب مفلس کہا جا سکے۔ موہن اب بازار میں نکلتا ہے۔ تو اسپر انگلیاں اُٹھتی ہیں۔ ایک تو وہ خوبصورت حد درجے کا تھا۔ اسپر کپڑوں کی سجاوٹ سونے پر سہاگے کا کام کرتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ سونے سے خوشبو نکل رہی ہے۔ ہر آٹھویں دن انکے نام سو روپے کے نوٹ پہنچ جاتے تھے۔ وہ کھاتے تھے! عیش کرتے تھے! مگر نہ جانتے تھے کہ ان کا گمنام مہربان کہاں ہے اور کون ہے؟ موہن تو کہتا تھا۔ کہ یہ میرے خط کے جواب میں پتا جی بھیج رہا ہے۔ مگر اُس کی بڑھیا ماں کو یہ جاننے کی زبردست خواہش تھی۔ کہ ہمارا مہربان کون ہے؟ اب وہ ایک نفیس مکان میں رہتے تھے۔ اور اُن کے آگے پیچھے نوکر پھرتے تھے۔ امیرانہ ٹھاٹ باٹ میں رہتے ہوئے بھی بڑھیا کے چہرے پر فکر کے آثار نمایاں رہا کرتے تھے۔ اور وہ فکر اپنے محسن کو جاننے کا تھا۔

ایک دن ایک کھڑکھڑاتی ہوئی گاڑی اُن کے دروازے پر رکی۔ اس میں سے ایک بابو باہر نکلا۔ اور موہن کو آواز دینے لگا۔ موہن نیچے اُترا بابو نے اُسے ایک کاغذ دکھایا۔

موہن پڑھنے میں نہایت ہوشیار تھا۔ جھٹ پٹ پڑھ گیا۔ سمجھ دار تھا۔ چند منٹ تک کچھ سوچتا رہا۔ اور پھر گاڑی میں چڑھ گیا۔ اور گاڑی ہوا ہو گئی۔

تین گھنٹے کے بعد موہن اُسی گاڑی میں واپس آیا۔ اُس کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا اور آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس کے ہاتھ پاؤں کانپتے تھے اور پاؤں چلنے میں لڑکھڑاتے تھے

اُس کی ماں نے گھبرا کر پوچھا "بیٹا تم کہاں گئے تھے؟ یہ تمہارا کیا حال ہے؟"

موہن نے رو کر کہا "ماں! آج میں نے اُس آدمی کے درشن کئے جو ہمیں متواتر کئی سال سے سو روپیہ ہفتہ وار بھیج رہا ہے۔"

بڑھیا نے بات کاٹ کر کہا "وہ کہاں ہیں مجھے بتاؤ۔"

موہن نے کہا "بات سن لو۔ مجھے وہاں جاکر خوشی بھی ہوئی۔ اور رنج بھی۔ خوشی اس لئے کہ اس آدمی کا ملاپ ہوا۔ جو پتا کا دھرم پال رہا تھا۔ رنج اس لئے کہ درشن آخری وقت ہوئے۔ ماں تم آنسو نہ بہاؤ۔ یہ دیکھو کاغذات! اپنی ساری جائداد میرے نام کر گئے ہیں اُن کی بڑی دولت ہے۔ بڑے کارخانے ہیں۔ بڑے ملازم ہیں۔ ایک دیانت دار منشی تمہارا حساب کتاب رکھیگا۔ اور ہم سے تنخواہ لے گا۔ مگر افسوس سیٹھ جی مر گئے وہ کہتے تھے کہ تمہارا خط مجھے تڑپا گیا جو تم نے پرماتما کے نام لکھا تھا۔"

ماں کی ممتا

"خون" خون خون"

"پبلک کے رکھوالو اُٹھو! سرکار کے تنخواہ دارو اُٹھو! جلدی اُٹھو!!"

"وہ کون ہے؟"

"حضور! ہمارا گھر لٹ گیا۔ ہم تباہ ہو گئے۔ ہمارے مکان میں خون کے پرنالے بہ رہے ہیں اور خنجر تیزی سے چل رہا ہے"

"ذرا بیٹھ جاؤ! اور سارا واقعہ سناؤ۔ اتنے عرصے میں رام دیال تم جا کر انسپکٹر صاحب کو جگاؤ۔ ہاں صاحب بات کیا ہے مفصل سنا جاؤ"

"حضور ہمارے آقا کشوری لال ہیں۔ ان کا لڑکا ذرا تیز طبیعت کا آدمی ہے رام دیال آج گنگا جی جانے کے لئے سیٹھ سے کہنے لگا۔ کہ مجھے سو روپیہ درکار ہے۔ سیٹھ جی نے کہا پچاس لے جاؤ۔ اور اگر ضرورت پڑی تو پچاس پھر منگوا لینا حضور جلدی کریں"

"کمبخت بات کو ختم کر۔ جلدی جلدی کیا لگا رکھی ہے (اونچی آواز سے) پندرہ آدمی طیار ہو جاؤ۔ ہاں صاحب پھر"

"بس حضور رام دیال بابو کو غصہ چڑھ گیا۔ اور اس نے سیٹھ جی کو دو تین سنا دیں اگر سیٹھ جی خاموش ہو رہتے۔ تب تو معمولی بات تھی۔ مگر چچا بھی گرم چچے کی گولیاں بھی گرم وہ بھی بول پڑے۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ گالیوں پر اتر آئے اور سیٹھ جی نے اسے دکان سے باہر نکلوا دیا حضور ابھی انسپکٹر صاحب نہیں آئے"

"سور بات کو ختم کرو۔ ورنہ پٹو گے"

"اچھا حضور جب رام دیال کو دکان سے نکلوا دیا گیا۔ تو وہ کچھ منہ میں بڑبڑاتا ہوا چلا

گیا اب گیارہ بجے کے قریب وہ گھر آیا۔ اور سیدھا بنگلہ پہنچا۔ جہاں سیٹھ جی چارپائی پر لیٹے تھے۔ اور رام دیال کی ماتا اُن کے پاؤں دبا رہی تھی دو تین منٹ گذرنے پر ہم نے چیخوں کی آواز سنی۔ ہیں بھاگا بھاگا گیا۔ تو کیا دیکھتا ہوں۔ کہ چاروں طرف خون ہی خون ہے۔ ماتا جی ہوش میں ہیں۔ اور رام دیال خون میں نہایا ہوا خنجر لئے تند نگاہوں سے مُردہ جسم کی طرف دیکھ رہا ہے۔ بس حضور "

"ارے لو انسپکٹر صاحب آ گئے"!

سپاہی بھی تیار ہو گئے۔ آگے آگے انسپکٹر صاحب ہوئے۔ اور ان کے پیچھے اُن کے رفیق سب جھومتے جھامتے باراتیوں کی طرح روانہ ہوئے۔

۲

انسپکٹر صاحب مع اپنے ساتھیوں کے سیٹھ کستوری لال کے عالیشان مکان میں پہنچے۔ سیٹھ صاحب کا کٹا ہوا سر موجود تھا۔ رام دیال کی ماتا کا بیہوش جسم موجود تھا۔ خون کے چھینٹے موجود تھے۔ لال خنجر موجود تھا۔ مگر قاتل کا پتہ نہ تھا۔ انسپکٹر صاحب نے آتے ہی ایک ایک کو دھمکانا شروع کیا۔ اڑوس پڑوس میں پکڑ دھکڑ ہونے لگی۔ راہ چلنے والے رکنے لگے، اظہار لئے گئے۔ نوکروں نے کہا۔ ہم نے قاتل دیکھا۔ وہ رام دیال تھا۔ شہادت کافی سے زیادہ بہم پہنچ گئی۔ ڈاکٹر بلایا گیا۔ اُس نے لاش کا معائنہ کیا۔ اور لکھ دیا۔ کہ موت خنجر کے کچوکوں سے واقع ہوئی ہے

پولیس دروازے پر جم کر بیٹھ گئی۔ چارپائیاں بچھ گئیں۔ اور کالی ماتا کے لئے بکرے بھینٹ چڑھنے لگے جنہیں گھر سوکھی روٹی بھی نصیب نہ ہوتی تھی وہ پلاؤ زردے کو ناک منہ چڑھا کر دیکھنے لگے۔ دماغ زمین سے آسمان پر پہنچا۔ ایسے خون کے مقدمے تو روز ہوتے رہیں۔ کچھ فائدہ ہی ہے؟

۳

آج عدالت کا کمرہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ تماشائی ٹوٹے پڑتے تھے اور جن کو اندر جگہ نہ ملی باہر سے ہی ایڑیاں اُٹھا اُٹھا کر شیشوں سے جھانکنے لگے۔ وقت مقررہ پر جج صاحب تشریف لائے۔ چاروں طرف ہیبت خیز خاموشی چھا گئی۔ لوگ سانس لیتے تھے۔ مگر رُک رُک کر کہ کہیں آواز نہ نکل جائے۔ رام دیال ہتھکڑیوں سے جکڑا ہوا کٹہرے میں کھڑا تھا۔ اُسکا سر جُھکا ہوا تھا۔ اور اُس کے چہرے پر ہزاروں نگاہیں جم رہی تھیں سرکاری وکیل اپنی تقریر ختم کر چکا تھا۔ ملزم کی طرف سے صفائی کے گواہ پیش ہو چکے تھے۔ آج ملزم کے وکیل مسٹر ٹامسن بیرسٹر ایٹ لاء کی تقریر تھی۔

مسٹر ٹامسن کھڑے ہوئے اور کھانس کر بولے۔

"خواہ کتنی ہی لڑائی کیوں نہ ہو خواہ کتنا ہی رنج کیوں نہ ہو۔ مگر بیٹا جب باپ کو مصیبت میں دیکھتا ہے۔ یا باپ جب بیٹے کو تکلیف میں پاتا ہے۔ تو سارا رنج سارا غصہ اور سارا بغض آن واحد میں دُور ہو جاتا ہے۔ خون جوش مارتا ہے۔ اور اگلی پچھلی کہی سُنی باتیں بھول جاتی ہیں۔ پھر یہ کس طرح ممکن ہے۔ کہ بیٹا اپنے باپ کو قتل کر دے۔ اور اپنی ماں کے سامنے جس کی تکلیف وہ کبھی دیکھ ہی نہیں سکتا۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ جھگڑا بالکل معمولی تھا۔ اور بیٹے کو باپ نے محض دکان سے باہر نکلوا دیا تھا۔ اتنی سی بات پر بیٹے سے یہ اُمید نہیں کی جا سکتی۔ کہ وہ باپ کے قتل پر آمادہ ہو جائے۔

"رام گڑھ کے پندرہ آدمیوں کی شہادت جہاں سے ملزم گرفتار ہو کر آیا ہے۔ ہو چکی ہے۔ کہ انہوں نے ملزم کو وہاں ۲۷ تاریخ کو کبڈی کھیلتے ہوئے دیکھا۔ حالانکہ قتل کی واردات ۲۸ تاریخ کی رات کو ہوئی ملزم نے باپ کے نام ۲۸ تاریخ کی شام کو ایک کارڈ لکھا ہے۔ جس میں پچاس روپے مانگے ہیں۔ میں یہ کارڈ عدالت کے آگے پیش کرتا ہوں۔ اس پر ۲۸ تاریخ کی شام کی مہر ہے۔

"قتل کے وقت مقتول کی عورت اُس کے پاس تھی۔ یہ عورت ہی ہے۔ جو قاتل کو سب سے

اچھی طرح دیکھ سکتی ہے۔ اور اُس کی شہادت ہے۔ کہ قاتل رام دیال نہیں۔ بلکہ کوئی بڈھا آدمی تھا۔ کہا جا سکتا ہے۔ کہ ماں نے بیٹے کی جان بچانے کو جھوٹ بولدیا۔ مگر اسوقت جبکہ شوہر کی لاش اُسکے سامنے پڑی ہو۔ وہ بیٹے کی محبت کی پرواہ کسی بھی حالت میں نہیں کر سکتی۔

اب سوال یہ ہے کہ مقتول کا قاتل کون ہے۔ میرا خیال ہے کہ کوئی قرضدار ہوگا جس نے افلاس کے ہاتھوں تنگ آکر قرض لیا ہوگا۔ اور ادا نہ کر سکتا ہوگا۔ مقتول گالیاں نکالنے کا عادی تھا۔ اُس نے گالیاں دی ہونگی۔ اور غریب مفلس نے کر دینے کی ٹھان لی ہوگی"

تقریر ختم ہو گئی۔ لوگوں کی رائے ابھی ابھی رام دیال کے خلاف تھی۔ ایک گھنٹہ کے بعد اُس کے حق میں ہو گئی۔ عدالت برخاست ہوئی۔ دس دن کے بعد لوگوں نے دیکھا کہ رام دیال دو گھوڑوں والی فٹن میں بیٹھ کر سیر کو جا رہا ہے۔ یہ سب مسٹر ٹامس کی مہربانی تھی۔ یا رام گڈھ اور شام گڈھ کے سب پوسٹماسٹر صاحبان کی۔

۴

لاکھوں کی جائداد رام دیال کو ملی۔ جو کل پھانسی پر لٹکنے کو تھا۔ اور جس کو کل اپنی زندگی کی اُمید نہ تھی۔ آج سینکڑوں زندگیاں اُسی کے سہارے ہو گئیں۔ جوانی نے اُس کی آنکھوں پر پٹی باندھی۔ دولت نے ایک اور تہ دی۔ اور عورت نے اُسپر تیسری گرہ باندھ دی۔ بہو اور ساس کی عموماً نہیں بنا کرتی۔ ساس چاہتی ہے۔ بہو دب کر رہے۔ بہو چاہتی ہے آزادی کے مزے لوٹے۔ ایک طرف تجربہ کاری۔ دوسری طرف الھڑ پن۔ ایک طرف پیرینہ سالی دوسری طرف نوجوانی۔ ایک طرف بڑھاپے کا سرد خون۔ دوسری طرف جوانی کے ولولے۔ بنے تو کیسے بنے۔ اور نبھے تو کیسے نبھے۔ شام وتی اُن ماؤں میں سے نہ تھی۔ جو اپنی بہوؤں کو دیکھ کر جلتی ہیں۔ وہ بہو کلا کو پیار کرتی تھی۔ اور دل و جان سے پیار کرتی تھی۔ مگر کو کلا اسے پسند نہ کرتی تھی۔ اُس کے ماتھے پر بل ہی رہتے تھے۔ رام دیال کو پھانسی کے رستے پر سے اُتار نیوالی

شام وتی ہی تھی۔ اُس نے جھوٹ کہا کہ قاتل رام دیال نہیں تھا۔ اور اُسی نے رام گڈھ۔ اور شام گڈھ کے ڈاک خانے والوں سے مِلکر کارڈ پر جھوٹی مہریں لگوائیں۔ کارڈ کیسے لکھا گیا۔ یہ راز سربستہ ہی رہا۔

اتنا کچھ کرنے پر بھی کلا کا مُنہ سیدھا نہ ہوا۔ اور ماتھے کے بل نہ اُترے۔ خاوند کو چوبیس گھنٹے سِکھا سِکھا کر اُس نے آخر رضامند کر لیا۔ اور رام دیال نے کوئی دو ہزار کا زیور دیکر شام وتی کو علیحدہ مکان میں رہنے کا حکم دے دیا۔ ماں نے یہ سُنا۔ اور چپ چاپ علیحدہ مکان میں چلی گئی۔

(۵)

جہاں مٹھاس ہوتی ہے۔ وہاں مکھیاں ضرور آ جاتی ہیں۔ رام دیال کے پاس دولت آئی۔ تو ساتھ ہی زمانہ بھر کے چھانے ہوئے لُچّے لُنڈے لُسپ لواڑ یار دوست بھی آ گئے خوشامد کی کسی کے پاس کمی ہے جتنی کوئی چاہے کرے رام دیال انجان تھا خوشامد کی باتوں کو سچ سمجھ بیٹھا۔ اور مکھیوں کی طرح مٹھاس میں پھنس گیا۔ شرابی بنا۔ رنڈی بازی کا چسکا پڑا اور دولت کافور کی طرح اُڑنے لگی۔

ایک رات جب وہ اپنے مکان کو آ رہا تھا۔ تو اپنی ماں کے مکان سے اُسے کراہنے کی آواز آئی۔ وہ ٹھٹھک گیا۔ اتنے میں ایک عورت اندر سے نکلی اور کہنے لگی۔

"میں واری بیٹا ذرا اندر آؤ۔ تمہاری ماں مر رہی ہے"

"رام جی جو اُپائے پھر میرے جانے سے بچ جائے گی؟"

"ہاں وہ تمہیں دیکھنا چاہتی ہے"

"مگر میں اُسے دیکھنا نہیں چاہتا"

اس پر اُس عورت نے کہا۔ بیٹا وہ تمہاری ماں ہے۔ اور مر رہی ہے۔ ایک دفعہ اندر چلو۔ اور اُس کے پاس ہو بیٹھو۔ وہ تو رام دیال رام دیال پکار رہی ہے۔ ہا! تمہارا دل کتنا پتھر ہے!

رام دیال آج لالچ سے مرلینے دو پھر میں درشن کرلوں گا۔ مگر دیکھو اُس کے پاس زیور ہے وہ کہیں تم نہ اُڑ لینا۔ ذرا ایک کر پکڑ لانا کہیں گم نہ ہو جائے۔ اگر ماں نے مرنا ہے۔ تو زیور اُسے بچا نہ لیگا۔ اور اگر نہیں مرنا تو وہ بچ ہی رہے گی۔ پھر زیور کی کیا ضرورت ہے خواہ مخواہ خطرے میں رہیگا"

"شرم! شرم!! رام دیال شرم!!!"

یہ آواز سُن کر رامدیال نے نگاہ اُٹھائی۔ تو حکیم ہری کیول کرشن سامنے کھڑے تھے اُنہوں نے پھر کہا۔

"نالائق یہ باتیں نکلنے سے تیری زبان جل کیوں نہیں جاتی"

رام دیال نے دیدیا۔ بس بس زبان کو سنبھالو بکواس نہ کرو میں لحاظ کر رہا تھا"

آواز زور کی تھی۔ سارا محلہ باہر نکل آیا۔ اور رامدیال کو جھوٹا کرنے لگا۔ رام دیال نے چپ چاپ گھر میں گھس جانا ہی مناسب سمجھا۔

رامو۔ شامو۔ گامو۔ تین بدمعاش تھے۔ جن سے شام گڈھ اور گردو نواح کے لوگ کانپتے تھے۔ اور کسی کی مجال نہ تھی کہ اُن کے سامنے چوں کر جائے۔ ذرا سی بات پہ خنجر نکال لینا۔ اور چلا دینا۔ ان کے لئے معمولی بات تھی۔ کسی کو قتل کر دینا۔ کسی کو لوٹ لینا۔ کسی کو بے عزت کر دینا اُن کے بائیں ہاتھ کا کرشمہ تھا۔ تینوں بدمعاش رامدیال کے یار غار بنے ہوئے تھے۔ حکیم ہری کیول کرشن سے لڑکر رامدیال گھر پہنچا۔ تو اُس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ اور آنکھوں سے شعلے نکلتے تھے

رامو۔ "کیا بات ہے جی؟"

شامو۔ "ہائیں! آپ کچھ گھبرائے ہوئے ہیں؟"

گامو۔ "میرے آقا! بات کیا ہے؟"

رامو۔ "آپ کو کسی نے کچھ کہا ہے کیا؟"

شامو:- میں اُس کا خون پی جاؤں ۔"

گامو:- میں اُس کی ہڈیاں چبا جاؤں ۔"

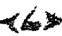
رامو:- میں اُسے تلوار کے گھاٹ اُتار دوں ۔"

سب کے سب (زمین پر گر کر) ہمارے آقا! ہمارے مالک! حکم کر۔"

رامدیال:- حکم۔ حکم یہ ہے کہ حکیم ہری کیول کرشن کی لڑکی کامنی کو پکڑ لاؤ۔ جب تک میں اُسے بے عزت نہ کرلوں گا۔ تب تک پانی پینا حرام۔ روٹی کھانا قسم ۔"

گامو:- واہ واہ! یہ بھی کوئی مشکل بات ہے۔ آج نہیں تو کل سہی۔ رامدیال نے انتقام سے قہقہہ لگایا۔ اور اندر بیٹھی ہوئی کوکلا کا دل جل گیا۔ پرماتما میرے خاوند کو کیا ہوگیا ہے۔ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہوگا ۔"

دوسرے دن جو کچھ ہونا تھا ہوگیا۔ شریف حکیم ہری کیول کرشن کی شریف کنواری بچی کی بے عزتی ہوگئی۔ حکیم جی نے سُنا۔ اور سر پیٹ لیا۔ مگر سمجھدار آدمی تھے۔ زیادہ مٹی اُڑانا مناسب نہ سمجھ کر چپ ہو رہے۔ اور یہ بات کسی دوسرے کے کانوں تک نہ پہنچی ۔



بُری چالوں کا انجام بُرا ہوتا ہے۔ رامدیال بُرے راستے پر جا رہا تھا۔ تباہ اور ہلاک ہوگیا۔ لاکھوں کی جائداد مٹی میں مل گئی۔ اور پیسے پیسے کو محتاج ہوگیا۔ اب اُس کے یار دوستوں نے منہ موڑ لیا۔ اور ایک طرف ہو گئے ۔

کوکلا کڑھتی تھی۔ اور اندر ہی اندر جلتی تھی۔ مگر کیا کرتی۔ اُس کا زیور ایک ایک کرکے بک چکا تھا۔ اور اب اُس کے پاس ایک تیلی تک نہ تھی۔

رامدیال بیماری میں بیہوش پڑا تھا۔ اور کوکلا پاس بیٹھی رو رہی تھی مگر رونے سے بیماری کو افاقہ نہیں ہو جاتا۔ وہ روتی ہوئی ڈاکٹروں کے پاس گئی۔ مگر کسی ڈاکٹر نے بغیر فیس کے اُسے دیکھنا منظور نہ کیا۔ ڈاکٹروں کے دل پتھر ہوتے ہیں۔

حکیم ہری کیول کرشن ایک ایسا آدمی تھا جو پیسے کی پرواہ کرتا تھا۔ شاید وہی آ جائے ایسا سوچکر کو کلا اُس کے پاس گئی۔ مگر اُس نے صرف یہ جواب دیا۔ "کہ میں رام دیال کا علاج دو ہزار فیس لیکر کروں گا۔ اس سے کم ایک پائی نہیں لوں گا۔" اس کی آنکھوں کے آگے اُس کی معصوم بچی کی تصویر پھر گئی۔

کوکلا نے کہا۔ "میں اپنے کپڑے بھیجدیتی ہوں۔ اور فیس دیکر ڈاکٹر کو لے آتی ہوں۔"

مگر کسی نے اُسے بتلایا۔ کہ تپ محرقہ کا علاج صرف حکیم ہری کیول کرشن کے پاس ہے۔

کوکلا تڑپی اور خاوند کے پاس جاکر رونے لگی۔ اُڑتی اُڑتی خبر شام دتی کو ملی۔ وہ دیوانی سی ہوکر حکیم ہری کیول کرشن کے مکان پر آئی۔ اُس کے پاؤں پر گری اور اپنا سارا زیور اُس کے آگے رکھ کر کہنے لگی۔ میرے بچے کو راضی کر دو۔ یہ سب کچھ لے لو۔ اور میرا مکان بھی لے لو۔ مگر کسی طرح میرے لاڈلے کو اُٹھا دو۔ اُسے تندرست کر دو۔"

حکیم کیول کرشن دنگ رہگیا۔ آہ یہ وہ ماں ہے جو مر رہی تھی۔ تو رام دیال زیور کے لئے تڑپ رہا تھا۔ آج وہی ماں وہی زیور لیکر اُسی بچے کو بچانے آئی ہے۔ اُس نے کہا۔

"بہین! تم اس نالائق کے لئے یہ سب کیوں دیتی ہو؟"

"شاموتی نے روکر کہا۔ جب سے سنا ہے۔ کہ بچہ بیمار ہے۔ اس وقت سے دل میں برچھیاں چبھ رہی ہیں۔ آخر وہ میرے دل کا ٹکڑا ہے۔ اور جب ایک حصے کو درد ہے۔ تو دوسرے کو کیوں نہ ہو گی؟" حکیم جی نے سارا زیور واپس دیکر کہا جاؤ! بہین جاؤ! میں اپنی غرض برباد کرنے والے کو راضی کر دوں گا۔" شاموتی نے سر جھکا کر جواب دیا۔ پرماتما تمہارا بھلا کرے۔"

تاریکی میں روشنی

ایک چھوٹی خوبصورت لڑکی تھی۔ جس کی نگاہ سے معصومیت۔ اور چہرے سے سادگی ٹپکتی تھی۔ وہ مسکراتی تھی۔ اور دیکھنے والے پر جادو کا اثر ہو جاتا تھا۔ مگر جانتے ہو؟ وہ کون تھی؟ وہ کنواری بیوہ تھی۔ اور نہ جانتی تھی۔ کہ اس کے کیا معنی ہیں؟

کچھ عرصہ گذرا۔ جب اُسے بتایا گیا تھا۔ کہ تمہارا خاوند مر گیا ہے۔ بتانے والوں نے اُسے یہ بتا کر رونا شروع کیا۔ وہ بھی روئی۔ اور بات گئی آئی۔

وقت گذرتا گیا۔ اور وہ اپنے سنہری زمانے کے دن بے پرواہی بیفکری سے کھیل کود میں گذارتی گئی۔ اُس کا وقت بڑے مزے سے کٹتا تھا۔ وہ کھاتی تھی۔ وہ پیتی تھی۔ اور پڑھتی تھی۔ وہ ابھی چھوٹی تھی۔ اور اُس کے باپ کی جو ہر وقت اور ہر گھڑی غمگین رہا کرتا تھا۔ کوشش تھی۔ کہ اُسے گرم ہوا تک نہ لگے وہ چھوٹی تھی۔ اور سارے گھر کا انتظام کرتی تھی۔ جب اُس کا غریب باپ تھوڑی سی تنخواہ جو اُسے ملتی تھی لاتا۔ تو سب چھوڑ کر اُسی کے ہاتھ میں رکھتا اور اُس کا اختیار ہوتا۔ کہ جس کو چاہے دے جس کو چاہے نہ دے۔ وہ ایک ایسا دیوتا تھا جس کو گھر کے سارے لوگ محبت قدر۔ اور عزت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ جب ہی کوئی اجنبی اُس کے مکان پر آتا۔ وہ اُس کو محبت بھری نظروں میں دیکھتا۔ اور وہ یہ جانتی تھی۔ وہ خوش تھی۔ مگر نہ جانتی تھی۔ کہ اس خوشی کے پیچھے ایک سیاہ بادل اُمڈا آ رہا ہے۔ جو کڑک کڑک کر اور گرج گرج کر برسے گا۔ خوشی کے پودے کو اُکھاڑ دیگا۔ گلا دے گا۔ اور اُس کی زندگی کو مایوسی کی زندگی بنا دیگا۔

گھر کا فرشتہ

وقت گذرا اور وہ بڑی ہوئی۔ بچپن کی مسکراہٹ اُس کے چہرہ پر دکھائی نہ دیتی تھی اُسے بولتی چالتی نہیں اور اُٹھنے بیٹھنے میں احتیاط کرنی پڑتی تھی۔ برادری دروازے پر آ گئی اور اُسے دوزخ میں پھینکنے کی تجاویز ہونے لگیں۔ اُس کے باپ نے کہا۔ مجھے مرنا منظور، مجھے سب کچھ منظور، مگر لڑکی کا سر نہ مونڈا جائیگا۔ ہرگز نہ مونڈا جائیگا۔ وہ ریفارمر نہیں تھا۔ مگر اُس کے سینے میں ایک دل ضرور دھڑکتا تھا۔ جو اُسے کہتا تھا۔ اور نصیحت کرتا تھا کہ بیٹی کا سر منڈا کر اُسے بدصورت نہ بناؤ۔ اُس کے جسم کو نقصان نہ پہنچاؤ۔ اُس کے دل کو ٹھیس نہ لگاؤ۔ وہ گھر میں ہر دلعزیز لڑکی تھی۔ اور اب ہر دلعزیز عورت بن گئی۔ اُس کے سامنے اُس کی ماں جھک گئی اُس کے بعد بڑی بہن جھک گئی۔ اور وہ گھر میں رعب داب سے کام کرنے لگی۔ وہ گھر کی شہزادی تھی؛ فرشتہ تھی۔ اور دیوی تھی۔ وہ محبت جو پہلے اس کے خاوند کا حق تھا۔ اُس نے اپنے بھائیوں کو دی، اپنی بہنوں کو دی۔ سارا گھر محبت سے بھر گیا۔ کیونکہ اُس کا دل محبت سے بھرپور تھا۔ سارا گاؤں اس روشنی کی طرف دیکھتا تھا۔ اور روشنی چمکتی تھی۔ وہ گھر کا فرشتہ تھی

وہ بڑی ہوئی دنوں سے مہینے اور مہینوں سے سال گذر گئے۔ اس نے صحت میں ترقی کی، خوبصورتی میں ترقی کی، اور علمیت میں ترقی کی؛ جو وقت وہ گھر کی خدمت سے بچاتی تھی اُسے کتابوں کی نذر کر دیتی تھی۔ اُس نے صبر استقلال اور عفو کے دیوی دیوتاؤں کی کہانیاں پڑھیں اور اُن کا عطر نکالا۔ جب وہ مطالعہ کتب میں مشغول ہوئی ہوئی دردناک حصّے پر چیخ چیخ پڑتی۔ اُس کا باپ انسانی عمر کے مختلف درجوں کا مطالعہ کرتا۔ وہ جسے کچھ عرصہ پہلے سب کے سب محبّت کرتے تھے۔ اب خود دوسروں کے ساتھ اظہار ہمدردی کرنے لگی۔ اُسکے باپ نے علمیّت میں اتنی ترقی نہ کی۔ جتنی اُس نے کر لی۔ نہ اُس کے بھائیوں نے نہ اُس کی علمیافتہ بہن نے۔

آدرش ہندو گھرانہ

کیا گھر میں کوئی آدمی یا عورت بیمار ہے۔ اگر ہے تو وہ مبارک ہے۔ کیونکہ کنواری بیوہ اُس پر جھک کر پرماتما کے حضور میں اُن الفاظ میں جو پرماتما تک پہنچنے چاہئیں (کیونکہ وہ ایک معصوم اور بے داغ دل سے نکلتے ہیں) اس کی بیماری اور اُس کی تکلیف دور کرنے کے لئے پرارتھنا کر رہی ہے مریض کی دُعا ہو سکتا ہے۔ کہ نامنظور ہوتی۔ مگر کنواری بیوہ کی پرارتھنا ضرور منظور ہوگی۔ وہ مریض کو دوائی دئے بغیر اس دل سے جو مریض کے دل کے ساتھ ساتھ دھڑکتا تھا۔ اور اُسکا رنج اور اُسکا غم محسوس کرتا تھا۔ ہفیوٹائیز کرکے تندرست کر دیتی کوئی ماں اس سے زیادہ محبت اور ہمدردی ظاہر کرتی ہوگی جتنی کنواری بیوہ کرتی تھی یہی وجود تھا یہی ہستی تھی جس نے اس گھر کو آدرش گھر بنا دیا تھا۔ وہاں شانتی تھی محبت تھی۔ اور سورگ کی ہوائیں تھیں۔

آہستہ آہستہ نا واقفیت میں اُس کا دل پرماتما کے قدموں میں جھک گیا وہ محسوس کرنے لگی۔ کہ کوئی اعلےٰ ہستی ہے۔ جو میری پرارتھنا کو سنتی ہے بادل گرجتا بجلی چمکتی۔ وہ پرارتھنا کرتی مطلع ایک پل میں دیکھتے دیکھتے صاف ہو جاتا۔ تب وہ افسوس کرتی۔ وہ ہاتھ ملتی اور کہتی۔ میں نے پرماتما کی مرضی کے خلاف کام کیا۔ آہ! اس کے خیالات اس کے جذبات کیسے پاکیزہ تھے سارے گھر میں محبت۔ ہمدردی اور ہارمنی کی بارش کرتے ہوئے وہ اپنے سینے میں خلا محسوس کرتی تھی پرماتما نے اُسکا ہاتھ پکڑا۔ وہ اُونچی اُٹھی اور اُسکے ساتھ ہی اردگرد کی اشیا بھی اُوپر اُٹھیں۔ اُسکا اثر زیادہ تھا۔ پاکیزہ تھا۔ اور دیوتاؤں کا سا تھا

سب سے زیادہ موثر شے

تیزی کے ساتھ بہتے ہوئے دریا کی طرح محبت کی ندی اُس کے سینے میں بہ رہی تھی جو اس کے بھائیوں کے لئے تھی۔ بہنوں کے لئے تھی۔ ماں اور باپ کے لئے تھی۔ وہ اُونچے اُٹھے کیونکہ کنواری بیوہ اُن کی نگہبان تھی۔ نمونہ تھی۔ مثال تھی۔ شاعر نے محبت کو دُنیا بھر میں

سب سے زیادہ مؤثر شئے قرار دیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

"محبت پرماتما کی لاثانی بیٹی ہے اور اُسے ہم جنہوں نے رُوحانی باپ کا چہرہ نہیں دیکھا۔ اعتقاد سے اور صرف اعتقاد سے مان لیتے ہیں اور بغلگیر کر لیتے ہیں"

وہ اُسے محبت کرتی تھی جسے اس نے سب سے زیادہ سزا دینی ہوتی تھی۔ جو یہ سنتا تھا۔ وُہی مان لیا کہ وہ دیوی ہے۔ فرشتہ ہے۔

یہ محبت گھر سے پڑوس میں اور پڑوس سے سارے گاؤں میں پھیل گئی۔ ایک عو کی مثال نے سینکڑوں گھروں کا نقشہ پلٹ دیا۔ اور انہیں بہتر بنا دیا۔

جب یہ خوشی کی مسرت کی اور آرام کی حالت تھی۔ گھر بکھر گیا۔ باپ جو کماتا تھا۔ کما نے گھر سے نکل بھاگا۔ اور مفلسی گھر میں داخل ہوئی۔ انتظام بگڑا۔ تکلیفیں بڑھیں۔ او تھا جب کنواری بیوہ کی عظمت ظاہر ہوئی وہ ٹوٹے ہوئے دلوں پر مرہم رکھتی تھی۔ و اور تسلی کے الفاظ بولتی تھی وہ روتے ہوالوں کے آنسو پونچھتی تھی اور اُن کا حوصلہ بندھا اس مصیبت کے وقت اپنی بوڑھی ماں کو سرمن دیتی تھی۔ اور اُس کا حوصلہ بندھ جا جب اُس کے بھائی رونے لگتے۔ وہ انہیں دیوی اور دیوتاؤں کی کہانیاں سُنا کر کہتی کہ وہ ننھے معصوم اور بے سمجھ بچوں کو وہ کہتی۔ دیکھو آرام کے دن تو آنیوالے ہیں۔ گھبر ہو۔ یہ آندھی گذر جائیگی۔ اس نے رنج والم کو گھر سے نکالدیا اور اپنی طاقت سے خلا کو بھ

اس کے باپ نے جو بہت عرصہ کے بعد واپس آیا۔ گھر کی حالت دیکھ کر کہا۔ "پرماتم تمہارے خاوند کو مار دیا۔ یہ سب کچھ جانتا تھا۔ اور دیکھتا تھا ورنہ آج میرے بچوں کی۔ میری کی کیا حالت ہوتی۔ اس خیال سے ہی کلیجہ مُنہ کو آتا ہے"

کنواری بیوہ نے جواب دیا۔ پتا! پرماتما سب کچھ جانتا ہے۔ اسی کی تابعداری کرو! پرماتما نے یہ الفاظ سنے، اُن کی تکلیفات کو دیکھا۔ اور تاریکی میں روشنی کا

راستی کی فتح

چکرورتی اشوک کے نورنظر اور لاڈلے بیٹے کا نام کُنال تھا۔ اُسکے خوبصورت بالوں، نظرفریب آنکھوں اور چاند جیسے پیارے مکھڑے میں ایسی شانِ رعنائی تھی۔ جو کسی کسی خوش قسمت کے حصّے میں ہی آتی ہے۔ اور جس کے حصّے میں آتی ہے۔ اُسے ہی دوسرے انسانوں کی نگاہ میں اُونچا اُٹھا دیتی ہے۔ خوبصورتی قدرت کا بیش بہا عطیہ ہے۔ مگر اگر اسکو ساتھ ہی خوب سیرتی کا بھی ملاپ ہوجائے۔ تو سمجھو سونے پر سہاگہ ہوگیا۔ اور اُس سے خوشبو نکلنے لگی۔ کُنال میں جہاں ظاہری خوبصورتی تھی۔ وہاں باطنی نیکیوں کی بھی اُس میں کمی نہ تھی اُس کا چہرہ منوّر تھا۔ اور دل بھی منور تھا۔ اسکا جسم سجیلا تھا۔ اور روح بھی سجیلی تھا۔ وہ بازار میں نکلتا۔ تو لوگ دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے اور گھر میں جاتا۔ تو آنکھیں راہ میں بچھائی جاتیں اور دل پیشوائی کو تڑپتے۔ کُنال خوش تھا۔ اور اُسکی آرزوؤں کا چمن مسرت و خوشی کی ہواؤں سے جھُوم رہا تھا۔ مگر اُسے معلُوم نہ تھا۔ کہ حادثات کی بجلی کڑک کڑک کر اور چمک چمک کر گریگی اور اُس کی خوُشی و شادمانی کے بوٹوں کو جلاکر خاک سیاہ کر کے پھینک دیگی۔ ایک دن کُنال آئینہ کے سامنے کھڑا اپنی آنکھوں کو دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ یکلخت ایک آواز آئی کُنال! یہ آنکھیں قائم رہنے والی نہیں ہیں۔ اِن کو قیام نہیں ہے۔ کُنال نے چاروں طرف دیکھا۔ مگر پتہ نہ لگا۔ کہ یہ آواز کس کی ہے؟ اور کہاں سے آئی ہے؟



دریائے بھاگیرتھی کے کنارے بیٹھکر کُنال خوبصورت لہروں سے کھیل رہا تھا۔ اور اپنی معصوُم کھیل میں اتنا محو ہو رہا تھا۔ کہ اُسے تن بدن کی ہوش نہ تھی۔ وہ اپنے آپ کو بھُول گیا تھا

بھولے کنال! آنکھ اُٹھا کر دیکھ۔ دو آنکھیں تجھے درختوں میں چھپ کر جھانک رہی ہیں۔ اور
تیری معصوم کھیل پر ایک حسینہ اپنی عصمت قربان کرنے کی ملیاریاں کر رہی ہیں۔
یکلخت کنال کے ماتھے پر ایک سرد ہاتھ کا احساس ہُوا۔ کنال چونک کر کھڑا ہو گیا
اُس نے دیکھا ماتا تشیہ رکھشتا سامنے کھڑی ہے۔
کنال کا سر جھک گیا۔ اور نگاہیں قدموں میں لوٹنے لگیں۔
تشیا رکھشتا نے کہا۔ کنال میں تمہیں بہت عرصہ سے چھُپ کر دیکھ رہی تھی!"
کنال نے ہاتھ باندھ کر جواب دیا "ماتا کو چھپ کر دیکھنے کی کیا ضرورت تھی!"
تشیہ رکھشتا نے پیچ وتاب کھا کر کہا "میں تمہاری خوبصورتی پر موہت ہو گئی ہوں۔ ان دو
آنکھوں نے میرا دل کھینچ لیا ہے!"
کنال کا خون جم گیا۔ اور اُس نے خیال کیا۔ کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ اُس نے اپنی انگلی
کاٹی۔ اپنی آنکھوں کو ملا۔ اپنے ہاتھوں کو رگڑا۔ اپنے آگے پیچھے دیکھا۔ اور جب اُسے یقین
ہو گیا۔ کہ میں خواب نہیں دیکھ رہا۔ بلکہ یہ عالم بیداری ہے تو اُس کا جسم پتھر کی طرح بے
حرکت ہو گیا۔ تشیہ رکھشتا اشوک کی نئی رانی تھی۔ اس لئے اُس کی ماتا تھی۔ ماتا کے مُنہ سے
یہ الفاظ سُن کر اس کے سینے میں آگ لگی۔ اور شعلے آنکھوں کی راہ سے نکلنے لگے پاگلوں
اور دیوانوں کی طرح وہ ہوائیں دیکھنے لگا۔
تشیا رکھشتا نے پھر حسین اور دلکش آواز میں کہا "پیارے کنال! میری طرف دیکھو!
میں تمہاری ناچیز کنیز بنتی ہوں۔ اور تم پرواہ نہیں کرتے۔ کہا۔ کہا تمہاری چھاتی میں دل نہیں ہے

ان شوخ حسینوں پہ جو مائل نہیں ہوتا کچھ اور بلا ہوتی ہے وہ دل نہیں ہوتا

کنال نے پھر سر جھکا یا "ماتا! ماتا! تو میری ماتا ہے! ماتا کے مُنہ سے یہ الفاظ اچھے نہیں
لگتے میں تیرا بیٹا ہوں۔ تو مجھ سے بیٹوں کا سلوک کر۔ اور دھرم کے راستے پر چلنے کا اپدیش
جو صاف ہے اور روشن ہے۔ ادھرم کا راستہ خوبصورت تو ہے اور اُس پر پھول بھی بکھرے

ہوئے ہیں، مگر وہی پھول ہیں جو دیکھتے دیکھتے کانٹوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اور اُن کی نوکیں دل و جگر کو چھید ڈالتی ہیں۔"

گنہگار عورت نے منہ بنا کر جواب دیا "جو کچھ ہے یہیں ہے۔ مرنے کے بعد کون جانتا ہے کیا ہوتا ہے اور کیا ہوگا۔ ایک امید موہوم پر اس جہان کی خوشیوں کو قربان کر دینا کیسی جہالت کا کام ہے۔ تو خوبصورت ہے۔ میں خوبصورت ہوں۔ پھر کیوں نہ لطف اڑائیں۔ آجا کنال آجا۔

سو دل و جان سے بھاتی ہیں ادائیں تیری۔ منہ میرے پاس لا کہ لے لوں بلائیں تیری

کُنال نے کہا "وہ اور عاقبت؟"

تشیہ رکھشا نے ہنس کر جواب دیا "یہ سب فضول ڈھکوسلے ہیں۔ اور برہمن لوگوں نے گپیں گھڑ لی ہیں۔ تاکہ اُن کو زیادہ زیادہ دان ملے۔ پیارے کنال! نزدیک آ اور ..." یہ کہہ کر وہ آگے بڑھی۔ اور اپنے آپ کو کنال کی باہوں میں گرانا چاہتی تھی۔ کہ کنال پیچھے ہٹ گیا۔ اور تشیہ رکھشا زمین پر گر گئی۔ وہ جلدی سے اُٹھی۔ مگر کنال کا وہاں پر پتہ نہ تھا۔ اُس نے اپنی زبان کاٹی اپنے ہونٹ کاٹے اور آنکھوں سے آگ کے شعلے نکالتی ہوئی باواز بلند کہنے لگی "او نیچے اونچے آسمان سے باتیں کرنے والے درختو! اور زمین کے گلے لپٹنے والی ننھی ننھی گھاس سن رکھو جن آنکھوں نے میرے دل کا چین آرام اور صبر چھین لیا ہے۔ میں اُن آنکھوں کو ہلاک کئے بغیر نہیں رہونگی!"

پرتگیا سُن کر درختوں کے پتے سہم گئے اور ٹہنیاں ایک دوسرے کے گلے مل گئیں۔



اشوک بیمار ہو گئے۔ اور ایسے بیمار ہوئے۔ کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ شاہی حکیموں نے لاکھ سر پٹکا۔ ہزار کوشش کی۔ مگر اشوک مریض عشق کی طرح دن بدن زیادہ بیمار ہوتے گئے۔ جب اُنہوں نے دیکھا کہ اب بچنا مشکل ہے تو تشیہ رکھشا سے کہنے لگے "

پریا! میرا دل کنال کے دیکھنے کو تڑپتا ہے۔ اُسے بلوا لوں۔"

کنال ٹکشلا میں راجہ کنج کرن کے پاس گیا ہوا تھا۔ اور اشوک کو اس سے بے حد محبت تھی جب اشوک نے اپنا وقت قریب سمجھا تو اُس نے اُسے دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا

تشیہ رکھشا نے کنال کا نام سُنا۔ اور سوتا ہوا انتقام کا جذبہ جاگ اُٹھا۔ اُسے بھاگیرتھی کا کنارا یاد آگیا۔ اُسے کنال کی آنکھیں یاد آگئیں۔ اُسے کنال کی خوبصورتی یاد آگئی۔ اور اس کے ساتھ کنال کا گستاخانہ مگر دھرم کو لئے ہوئے سلوک یاد آگیا۔ اسکا خون جوش مارنے لگا۔ آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے اور دانتوں کو کاٹنے لگے تھرتھراتی ہوئی آواز میں وہ بولی۔

"کیا آپ اپنی زندگی سے ناامید ہو گئے ہیں؟"

راجہ نے جواب دیا "ہاں حکیموں کا بھی یہی خیال ہے"

تشیہ رکھشا نے کہا "لعنت ہے اُن کی حکمت پر۔ میں آپ کا علاج کرتی ہوں اور دیکھوں گی کہ آپ کسطرح ایک ہفتے کے اندر اندر راضی نہیں ہو جاتے۔ کنال کو بلوانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ شانتی رکھیں"

تشیہ رکھشا کے وچن سن کر اشوک کا چہرہ چمک اُٹھا۔ اور انہوں نے اطمینان کا سانس لیا

تشیہ رکھشا کو پتہ تھا۔ کہ دھرم آنند حکیم اشوک کی بیماری کا علاج جانتا ہے مگر چونکہ وہ خاص وجہ سے اشوک سے ناراض ہو گیا ہوا تھا۔ اس لئے باوجود وزرا کے کہنے کی بھی وہ اشوک کا علاج کرنے پر رضامند نہ ہوا۔

اشوک سے اقرار کرکے تشیہ رکھشا حکیم دھرم آنند کے ہاں پہنچی۔ اور اُس کے قدموں میں گرکر۔ روکر۔ گڑگڑا کر۔ لالچ دے کر۔ اُسے علاج کرنے پر رضامند کر لیا۔ دوائی تیار ہوئی اور تشیہ رکھشا نے اشوک کو پلوانی شروع کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ پانچویں ہی دن وہ تندرست ہو گئے اور احسانمندانہ نگاہوں سے تشیہ رکھشا کی طرف دیکھنے لگے۔

تشیہ رکھشا نے کہا "سوامی میری بھی ایک عرض ہے"

اشوک نے کہا "ہو کہو جو کہو گی منظور ہو گا"

تشیہ رکھشا نے جواب دیا "سات دن کے لئے بادشاہی"
اشوک نے سر جھکایا۔ اور کہا "منظور ہے"

(۴)

تشیہ رکھشا نے اپنے آپ کو تخت پر دیکھا۔ تو نشہ سا محسوس ہونے لگا۔ سر میں غرور کی ہوا بھری۔ اور اس نے کنال کی آنکھوں کو ہلاک کرنے کا سنہری موقعہ کھونا نہ چاہا۔ تکشلا کے حاکم کنج کرن کے نام احکام جاری ہوئے۔ کہ کنال نے ایک ایسا جرم کیا ہے۔ جس کی معافی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اس کی آنکھیں پھوڑ دو۔ اور تکشلا سے جلاوطن کر دو۔
یہ احکام دوت کو دیدیئے گئے اور اس پر اشوک کی مہر چسپاں کر دیگئی۔ جب یہ حکم کنج کرن کو موصول ہوا تو اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اور زبان خوف سے بند ہو گئی ع۔
خوف سے بند تھا منہ بات نہ کی جاتی تھی استخوانوں سے لرزنے کی صدا آتی تھی
کنال شریف تھا۔ خوبصورت تھا۔ اور دھرم کا پابند تھا۔ اس پر ہاتھ اٹھانے کی جراءت کون کرے گا؟
یہ سوچ کر کنج کرن کو رنج ہوا اور غم کے آنسو بہانے لگا۔ تُرش آنسو آنکھوں سے نہیں۔ بلکہ دل سے نکل رہے تھے۔

(۵)

کنال اپنی پیاری بیوی کانچن دیوی کے ساتھ ہنس کھیل رہا تھا۔ کانچن دیوی نے کہا "پران ناتھ آپ بڑی تیزی سے چلا کرتے ہیں۔ میں بھی اسی تیزی سے چل سکتی ہوں"
کنال ہنسا "واہ! یہ بھی کوئی بات ہے۔ میں تو ہار بڑی جلدی پرو سکتا ہوں"
کانچن دیوی نے کہا "اچھا میں آپ کو ہار پرو کر دکھاؤں"
کنال نے سامنے کے پھول کے بوٹے کی طرف اشارہ کر کے کہا "جاؤ۔ اور ایک نفیس سا ہار تیار کر کے لاؤ"

کانچن دیوی مسکراتی ہوئی اُٹھی اور بوٹے کیطرف چلی۔
اُسی وقت دو آدمی کمرے میں داخل ہوئے اور ایک کاغذ راجکمار کے ہاتھ میں دیکر مؤدب کھڑے ہو گئے۔
راجکمار نے کاغذ پڑھا۔ اُسپر اُسے یقین نہ آیا۔ اُس نے آنکھوں کو ملا۔ اور پھر پڑھا۔ پھر یقین نہ آیا۔ پھر نیچے دیکھا۔ اشوک کے نام کی مہر ثبت تھی۔ شک کی گنجایش نہ رہی۔ کاغذ کو سر پر رکھا۔ اور کہا "اس حکم کی تعمیل کون کریگا؟"
ایک آدمی نے آنسو بہاکر، اور سر جھکا کر جواب دیا "یہ بیچ کرم میرے سپرد کیا گیا ہے۔ لیکن میرا قصور نہیں......"
راجکمار نے بات کاٹ کر کہا "میں تمہیں قصوروار نہیں سمجھتا۔ راجہ اور پتا کی آگیا ماننا میرا ضروری فرض ہے۔ اور یہ حکم تو میرے راجہ اور پتا دونوں کی طرف سے ہے۔ راجہ کا حکم ماننا جیسا میرا فرض ہے۔ ویسا ہی تمہارا بھی ہے۔ آؤ۔ اور جلدی جلدی اپنا کام کرلو"
دونوں جلاد پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ اور چند منٹوں کے بعد اُن کے کانپتے ہوئے ہاتھوں نے راجکمار کی آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں کی پتلیوں کو باہر نکال کر پھینک دیا۔
جلاد جونہی محل سے باہر ہوئے۔ دیوی کانچن ہار پرو کر ناز اور فخر سے کمرے کی طرف آرہی تھی۔ اور ہار پتی کو دکھانے کی اُمنگ اُس کے چہرے کو چمکا رہی تھی۔ مگر آہ اُسے کیا معلوم تھا۔ کہ پتی و یکھنے والی آنکھیں ہی نکال لی گئی ہیں۔
جلدی جلدی سے جب دیوی کانچن زینے پر چڑھ رہی تھی۔ تو اُس کی گلابی ساڑھی سیڑھی کے ساتھ ساتھ چڑھنے والی بیل کے اُلجھ گئی۔ اور جب وہ اُسے چھڑانے لگی تو اُس کا اپنے ہاتھوں سے پرویا ہوا ہار گر گیا۔ اور بیل میں اُلجھ کر لٹکنے لگا۔ ہوا اُسے ہلانے لگی۔ اور وہ بہت خوبصورت دکھائی دینے لگا۔
"پران ناتھ! پران ناتھ!" دیوی نے کہا "ذرا ادھر دیکھنا"

راجکمار نے کہا کیا ہے"؟

اور جب اُس نے اپنی آنکھیں (۹) اُدھر اُٹھائیں۔ کانچن دیوی غش کھا کر گر گئی۔
اُسی وقت کنچ کرن راجکمار سے ملنے کے لئے آیا تھا۔ یہ دلسوز نظارہ دیکھ کر روتا ہوا۔
واپس پلٹ گیا۔

رات گذر گئی۔ دن چڑھا۔ کانچن دیوی کی بیہوشی دُور ہوئی۔ اور اس نے اشوک کا حکم پڑھ کر کہا۔ پران ناتھ! چلئے۔ اس ملک سے نکل چلیں۔ پتا جی کا دوسرا حکم ایسا ہی ہے"
راجکمار نے کہا "پریا تم اپنے باپ کے ہاں چلے جاؤ۔ جلاوطنی کا حکم مجھے ملا ہے تمہیں نہیں"
راجکماری نے رو کر جواب دیا "میں نے آپ کا ہاتھ پکڑا تھا۔ اگر آپ چھوڑ کر بھاگنا چاہتے ہیں۔ تو چلے جائیے! میں نہیں روک سکتی"
کنال نے اسے پکڑ کر گلے سے لگا لیا۔ اور کہا "میں تمہارے ہی بھلے کے لئے کہتا ہوں۔ تمہیں تکلیف ہوگی"
دیوی نے کہا "سوامن! میری خوشی آپ کی خوشی کے پیچھے ہے۔ مجھے آپ کی خدمت کرنے میں ہی خوشی ہے۔ مجھے ساتھ لے چلئے۔ ورنہ میں تڑپ تڑپ کر مرجاؤں گی"
راجکمار ایک بینا کو لیکر تکشلا کی حد سے باہر ہو گیا۔ بینا بجاتا تھا۔ جگر سوز گانے گاتا تھا۔ اور کانچن دیوی کے ساتھ اپنا وقت گذارتا تھا۔ اسی طرح کئی سال گذر گئے

(۶)

دیوالی کا دن تھا جب پاٹلی پتر میں ایک بھکاری اور بھکارن داخل ہوئے اُن کے ہاتھ میں دلکش بینا تھی۔ اور لبوں پر مؤثر گانے تھے۔ اُنہوں نے راج محل میں داخل ہونا چاہا۔ مگر دربانوں نے پیچھے ہٹا دیا۔

ساتھ اصطبل تھا۔ غریب خاوند بیوی نے وہیں پناہ لے لی۔ سارا شہر چراغوں سے دمک رہا تھا۔ اور روشنی کی شعاعیں پھوٹ پھوٹ کر آسمان کے ستاروں کو منہ چڑا رہی

تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد چراغ بجھ گئے۔ شور وغل ختم گیا۔ اور چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ لوگ سونے لگے اور اصطبل کے چوکیدار کو بھی نیند آنے لگی۔ مگر اس کے لئے نیند موت کی پیغامبر تھی اس لئے اس نے بھکاری سے کہا۔

"بھائی ذرا بینا ہی بجا تاکہ نیند ٹل جاوے"

بھکاری نے بین اٹھائی۔ اور بجانے لگا۔ ہوا ان دلکش آوازوں کو لے اُڑی اور پھولوں کی سیج پر سونے والے اشوک کے پاس جا پہنچی۔

اشوک غور سے سننے لگے آواز شناسا معلوم ہوئی۔ سو نہ سکے۔ اُٹھے اور باہر نکل آئے اصطبل میں داخل ہوئے۔ اور باپ بیٹے کا آنسوؤں کی دھار کے ساتھ ملاپ ہو گیا۔

تحقیقات کی گئی کہ کنال کی خوبصورت آنکھوں کو نکلوانے والا کون ہے؟ کنال نے خط سامنے کر دیا۔ راجہ نے حکم دیکھا۔ تاریخ دیکھی۔ پردہ آنکھوں سے ہٹ گیا۔ "ارے یہ سب تشیہ رکھشا کی کرتوت ہے؟"

کنال دوزانو ہو گیا۔ "مہاراج معاف کر دیں"

اشوک نے کڑک کر کہا۔ "کبھی نہیں۔ اس خوبصورتی کی ڈائن کو زمین کے اوپر نہیں نیچے رہنا چاہیئے"

جلادوں کو بلایا گیا۔ اور ان کے ساتھ تشیہ رکھشا کو بھیج دیا گیا۔

جب جلاد واپس آئے۔ تو انہوں نے کہا۔ مرتی ہوئی مہارانی نے کنال سے معافی مانگی ہے۔

کنال نے یہ سنا اور بے ہوش ہو گیا۔

تھوڑے ہی عرصہ کے بعد یہ اندھا کنال تخت پر بیٹھا۔ اور کانچن دیوی مہارانی کہلائی کنال اکثر یہ دوانہ کہہ دیا کرتا تھا۔ "کہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے۔ آخر فتح راستی کی ہی ہوتی ہے"

۵۰۰۰

(۱)

ماں باپ کی گفتگو سُنکر تلوتما کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ایک شعلہ تھا۔ جو پاؤں میں لگا۔ اور سر تک بھسم کرتا ہوا نکل گیا۔ ایک تیر تھا۔ جو سینے میں لگا۔ اور دل کو زخمی کر گیا وہ سوچنے لگی۔ کہ یہ عالم خواب ہے۔ یا بیداری ہے۔ سوتی ہوں یا جاگتی ہوں۔ ہوش میں ہوں یا بیہوش ہوں۔ باپ ایسا بے رحم، ایسا بے ترس اور ایسا ظالم ہو سکتا ہے۔ یہ اُسے یقین نہ آتا تھا۔ اس نے دانت پیسے، ہونٹ کاٹے۔ اور انگلی کو دبایا۔ جب بیداری کا یقین ہو گیا۔ تو آہستہ سے سرکی اور ٹھنڈی رات میں دروازے سے کان لگا دئے۔ آواز صاف صاف سُنائی دی۔ باپ کہہ رہا تھا۔

"دھرم کو شہد لگا کر چاٹو جب کھانے کو روٹی نہ ہو گی۔ اور قرضے کے بوجھ سے گردن جھک جھک پڑے گی۔ تو پھر کیا بنے گا؟"

یہ آواز سُنکر تلوتما سہم گئی۔ اور پیچھے ہٹ گئی۔ اسی وقت اُس نے ماں کی آواز سُنی۔ جو کہتی تھی۔

"ہم مر جائیں بلا سے۔ ہماری بے عزتی ہو۔ شوق سے۔ مگر بچی کو بڈھے سے نہ بیاہنے دونگی اس شادی کی بجائے تم اُسے زندہ کنوئیں میں کیوں نہیں دھکیل دیتے زمین میں کیوں نہیں دفن کر دیتے۔ زہر پلا کر ہلاک کیوں نہیں کر ڈالتے۔ گلے میں رسا ڈالکر پھانسی کیوں نہیں دیدیتے خوبصورت نازک جوان بچی کو بڈھے کے ساتھ باندھ رہے ہو۔ یہ ظلم اِن آنکھوں سے نہ دیکھا جائیگا۔ زمین پلٹ جائے۔ اور آسمان بدلجائے۔ مگر میری زبان اس امر کے خلاف

بولنے سے کبھی باز نہ رہیگی"۔

تلوتما کا دل خوشی سے دھڑکا۔ اور اسوقت اس کے قصائی باپ کی زہریلی آواز سنائی دی:

"تمہاری ان باتوں سے میں پانچہزار کی تھیلی تھوڑا ہی چھوڑ دوں گا۔ تم نے جو کچھ کرنا ہے کرو۔ میں اپنا کام کئے بغیر نہ رہونگا"۔

تلوتما خاموشی سے پیچھے ہٹ گئی۔ اور صحن میں بیٹھ کر رونے لگی۔ روتے روتے آنکھ لگ گئی۔ دیکھا ایک خوفناک صورت اُسے اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ وہ چلانے لگی۔ مگر خوفناک چہرے نے ہنس کر کہا۔ تمہارے باپ نے تمہیں فروخت کر دیا ہے۔ تلوتما نے کہا۔ غلط کہتے ہو۔ خوفناک ہنسی کے ساتھ جواب ملا۔ ابھی ابھی ۵ ہزار روپے چکا ہوں۔

پانچہزار کا لفظ سننا تھا۔ کہ تلوتما کی چیخ نکل گئی۔ اور آنکھ کھل گئی دیکھا۔ تو دن چڑھ چکا تھا۔ اور باپ باہر سے کوئی چیز بغل میں دبائے۔ گھر میں داخل ہو رہا تھا۔ تلوتما نے خیال کیا۔ اور دل نے تائید کی۔ کہ ۵ ہزار ہی ہیں۔ جو باپ نے میرے ہونے والے بڈھے شوہر سے لئے ہیں۔ اور معصوم گائے کو اس کے ظالم اور جلاد ہاتھوں میں دینے کا اقرار کر لیا ہے۔

(۲)

تلوتما دن رات اُداس اور غمگین رہنے لگی۔ ایک کیڑا تھا۔ جو اُسے اندر ہی اندر کھا رہا تھا۔ ایک غم تھا جو اُسے اندر ہی اندر کمزور کر رہا تھا۔ ایک جلن تھی جو اُسے جلا رہی تھی وہ دیکھتی تھی۔ تباہی اور بربادی کی زمین سامنے ہے اور اُسے زنجیروں میں جکڑ کر کوئی وہاں پہنچا رہا ہے جہاں آگ کا فرش ہے۔ اور شعلے جسکا آسمان ہے۔ جہاں بدکاری ہے بدمعاشی ہے بےحیائی ہے۔ جس کے چپے چپے میں بدبو ہے اور اینٹ اینٹ میں زہر کا رنگ جھلکتا ہے۔ جہاں آزمائشیں ہیں۔ اور ترغیبیں ہیں جہاں لالچ ہیں۔ اور گناہ آلود لذتیں ہیں۔ یہ دیکھ کر وہ کانپ جاتی۔ اور رو رو کر ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھا کر پرماتما سے پراتھنا

کرتی تھی۔ پر ایسا کرنے سے دل کا غبار ہلکا ہوتا۔ مگر جب باپ کا منحوس چہرہ دیکھتی۔ تو بجھی ہوئی آگ پر پھر سے تیل پڑ جاتا۔ اُسے غصہ چڑھتا۔ مگر کچھ نہ کرسکتی۔ اور خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتی۔

(۳)

شام کا وقت تھا۔ تلوتما صحن میں بیٹھی ہوئی رو رہی تھی۔ سوچ رہی تھی۔ کہ اب کرنا کیا چاہئے۔ شادی کا دن پاس آ رہا تھا۔ اور بربادی اُس کی آڑ میں چھپ چھپ کر قدم سرک رہی تھی۔ ایک ہفتہ بیچ میں تھا۔ اور اس اثنا میں اگر کچھ نہ کیا گیا۔ تو پھر تباہی اور بربادی کے سوائے کوئی چارہ ہی نہ تھا۔

تلوتما رونے لگی اور ہچکیاں بھرنے لگی۔ اس کا مستقبل تاریک تھا۔ جس میں چھری چل رہی تھی۔ اور معصوم خون کے فوارے اُچھل رہے تھے۔ وُہ رونا روک نہ سکی۔ تو پھوٹ پھوٹ کر چیخنے لگی۔ گھر میں نہ ماں تھی۔ نہ باپ اس لئے رونے کی آزادی تھی۔ جب وہ کھُلے دل آہ و زاری کر رہی تھی۔ کسی نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وُہ چونک کر پیچھے مُڑی اور اس سے "سکھی" کہہ کر لپٹ گئی۔

سکھی نے اُسے حیرت سے دیکھا۔ اور کہا تلوتما تجھے کیا ہو گیا۔ تیری رونق کہاں گئی رنگ کدھر گیا۔ اور چہرے کا نکھار کیا ہُوا۔

تلوتما نے ہاتھوں کو ملا۔ اور آسمان کی طرف اشارہ کیا۔

سرسوتی نے پھر کہا۔ "سکھی تیری کیا حالت ہے؟"

"جو دیکھتی ہو"

"کیا وجہ"

"قسمت کا لکھا"

"کس نے کیا؟"

"ماں باپ نے"

"کس ذریعے سے؟"
"شادی کے ذریعے سے!"
"کیا چاہتی ہو؟"
"موت!"

سرسوتی حیران رہ گئی۔ اور کچھ نہ سمجھ سکی جب اُسنے تلوتما کے چہرے پر نظر کی۔ وہاں اُداسی تھی۔ رنج تھا۔ اور افسوس تھا۔ اس کی آنکھوں کی طرف دیکھا۔ وہاں بےچینی تھی۔ بےکلی تھی۔ اور بےامنی تھی۔ آنسو پلکوں میں جھلک رہے تھے۔ اور اضطراب اُن کے پردے میں چھپا ہوا باہر کو جھانک رہا تھا۔ وُہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئی اور اسے کہنے لگی "! اپنا سب کچھ کہہ دو"

"تلوتما نے روتے روتے نامکمل جملوں میں اپنی داستان بیان کی۔ سرسوتی نے سُن کر دانتوں تلے اُنگلی دبائی اور غصّے میں آکر کہا" ایسے شریر باپ سے شریر بن کر ہی سمجھنا چاہیئے۔ تمہارے باپ کو چودہ ہزار سانپ کاٹ رہے ہیں۔ ان کے زہر سے وُہ نہ کچھ دیکھ سکتا ہے۔ نہ سُن سکتا ہے۔ میں ان سانپوں کو دُور کر دوں گی۔ کیسے کروں گی۔ یہ بتلانے کی ضرورت نہیں۔ میری انگوٹھی پہچانو"

"جب اسے دیکھو۔ جھک جانا۔ اور سمجھ جانا۔ کہ اس کام میں میرا ہاتھ ہے۔ اس کی مزاحمت نہ کرنا۔ اور جیسا کہا جائے۔ اس کی تعمیل کرنا!"

"تلوتما نے احسانمندانہ نگاہوں سے۔ سرسوتی کی طرف دیکھا۔ جہاں پیار بھی تھا۔ قہر بھی تھا۔ رحم بھی تھا۔ ظلم بھی تھا۔ بھولا پن بھی تھا۔ اور مکاری بھی تھی۔ ایک تلوتما کے لئے ایک اُس کے باپ کے لئے۔

(۴)

برات شہر میں آپہنچی۔ اور اس کے لئے استقبال کا انتظام مکمل کیا گیا۔ تلوتما کا باپ

جھکا کر دُولھا والوں کے ہاں گیا۔ اور معذرت کے طور پر کہنے لگا۔ آپ امیر ہیں۔ میں غریب ہوں ممکن ہے۔ آپ کو تکلیف ہو۔ اس کے لئے معاف کیجئے گا۔ میرے پاس بیٹی ہی بیٹی ہے۔ اُسے لیجایئے۔ وہ پتی کے پاؤں دھوکر پئے گی۔ اور اس کی سیوا کرنی زندگی کا مقصد سمجھےگی بڈھا دُولھا مسکرایا۔ کیونکہ وہ سمجھتا تھا۔ دل میں زہر اور باہر امرت بن کر ٹپک رہا ہے۔ زبان نہ کرتی ہے اور ہاتھ روپوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ روپیہ لیکر لڑکی کو بیچ رہا ہے۔ اور اس کے دان کی ڈینگ مار رہا ہے۔ دُنیا میں مکاری کے تول چلتے ہیں۔ اور جھوٹے بول عزت پاتے ہیں۔

۵

رات کا وقت تھا۔ اور چاروں طرف عالمگیر خاموشی کی حکومت تھی۔ تلوتما کی شادی کا لگن ۵ بجے کا تھا۔ تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ تین بجے کے قریب لڑکی کے والدین بھی ذرا لیٹ کر کمر سیدھی کرنے لگے۔ شام سے کام کر رہے ہیں۔ اب ذرا آرام تو کر لو۔ کمر بھی درد کرنے لگی ہے۔

"تلوتما کی ماں نے کہا۔ "کہئے تو ذرا ٹانگیں دبا دوں"

"نہیں۔ نہیں" تلوتما کے باپ نے کھانستے ہوئے کہا۔ "تم بھی ذرا آرام کر لو"

اور پانچ منٹ کے اندر اندر دونوں سو گئے۔

ان دونوں کے سونے کے بعد شادی والا گھر بھی قبر کی طرح اُداس ہو گیا۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ اور سناٹا تھا۔ عین اسی وقت۔

ایک آدمی کالے کپڑوں میں لپٹا ہوا آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا مکان میں داخل ہوا اور چاروں طرف دیکھتا جاتا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ صندوق کے پاس پہنچ گیا جس کی چابیاں نیند کی زیادتی اور کام کی شدت کی وجہ سے تالے کے ساتھ ہی رہ گئی تھیں۔ وہ گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گیا۔ اور صندوق کھول کر دیکھنے لگا۔ اس میں نوٹوں کا بنڈل دکھائی دیا۔ اُسے اُٹھا کر اس نے جیب میں رکھا۔ اور آہستہ آہستہ واپس جانے لگا۔ عین اسی وقت تلوتما کا باپ جاگا

اُٹھنا ۔ بھوت ! ا

اجنبی اچھلا اس کے اوپر جھپٹا ۔ اور خنجر اس کی گردن پر رکھ کر کہنے لگا "خبردار ایک لفظ تک منہ سے نہ نکلے"

بزدل لالچی بڈھا سانس کو روک کر بیٹھ دم پڑا رہا۔

کالے کپڑوں والا اجنبی بجلی کی سی تیزی کے ساتھ تلوتما کے کمرے میں گیا۔ اور سوئی ہوئی لڑکی کے سرہانے بیٹھ کر اسے ہلایا۔ پیشتر اس کے کہ وہ اس کی شکل و صورت سے ڈر کر آواز نکالے۔ سیاہ پوش نے اس کے آگے ایک انگوٹھی کر دی جسے دیکھتے ہی تلوتما نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور اٹھ کر کہا "کیا حکم ہے؟"

سیاہ پوش نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ میرے پیچھے پیچھے آ جاؤ گے۔ آگے آگے سیاہ پوش روانہ ہوا پیچھے پیچھے تلوتما

—— (۶) ——

دولھا سہرے باندھ کر شادی کرانے آیا۔ اور باجوں کا شور ہمراہ لیکر آیا۔ لیکن وہاں پہنچکر معلوم ہوا۔ کہ سونے کی چڑیا اڑ چکی ہے۔ اور باقی خاک کی چٹکی تک نہیں چھوڑ گئی۔ ایک طرف لڑکی کا باپ رو رہا تھا۔ اور دوسری طرف ماں کو غش پر غش آ رہے تھے۔ محلے والے الگ حیران تھے اور خویش و اقارب اپنا ماتھا لیکر بیٹھے ہوئے تھے۔ تلوتما غائب ہو گئی۔ یہ سنکر سب کے دل دھڑک رہے تھے۔ اور سب سر جھکا کر کھا رہے تھے۔ بڈھا دولھا خضاب لگا کر آیا تھا۔ اور رگڑ رگڑ کر چہرے کو صاف کر کے آیا تھا۔ اُسدن دو سال کے بعد نئے کپڑے ٹرنک سے نکلے تھے اور ریشمی رومال جیب میں لٹک رہے تھے۔ صافہ خاص فرمائش سے بندھوایا۔ اور چوڑی دار پاجامہ تین دفعہ پسینے میں نہانے کے بعد ڈالا تھا۔ یہ سب محنت زائل ہو گئی۔ یہ خیال کر کے اس نے اپنا صافہ اُتارا۔ اور اچھل کر اپنے سے کم عمر سسر کے گلے میں ڈال کر کہنے لگا "میرا روپیہ دے دو۔ ابھی وقت دیدو"

سُسر نے کہا "میں دیدیتا ہوں۔ ابھی دے دیتا ہوں"

داماد نے کہا "اسی وقت لائیے"

سُسر نے دل ہی دل میں کہا۔ افسوس جس روپے پر خوشی کے محل تعمیر ہو رہے تھے۔ وہ ہاتھ سے جا رہا ہے۔ اور ساتھ ہی سونے کے محل مٹی میں مل رہے ہیں۔ یہ خیال آنے پر اُسے تلو تما پر غصّہ آیا۔ لیکن اسوقت اس کا کیا حال ہوا؟ جب صندوق خالی ہے۔ اور نوٹوں کا بنڈل غائب دکھائی دیا۔

وہ بدحواس ہو کر بڈھے داماد کے پاس آ کر اس کے پاؤں پر گر پڑا اور کہنے لگا مجھے بچاؤ۔ مجھے بچاؤ۔

داماد نے کہا "مجھے میرا روپیہ دیدے"

سُسر نے کہا "اُسے کوئی چرا کرلے گیا ہے"

داماد نے روپیہ محنت سے اکٹھا کیا تھا۔ یہ صدمہ برداشت نہ کر سکا۔ اور پاگلوں کی طرح چلّانے لگا۔

"میرا ۵۰۰۰، میرا ۵۰۰۰"

آخر برادری نے فیصلہ کیا۔ کہ تلو تما کا باپ پچاس روپے ماہوار اس کو ادا کرتا جائے لیکن وہ غریب تھا۔ اس کی اتنی آمدنی ہی کہاں تھی۔ ادا کرنے کا خیال دماغ میں تھا۔ نتیجہ یہ ہؤا۔ کہ اس کے دماغ میں بھی خلل آ گیا۔ اور وہ بھی بکنے لگا۔

"۵۰۰۰ میرا ۵۰۰۰"

رات کو جب یہ آواز گلیوں میں سنائی دیتی تو عورتیں اپنے بیٹوں کو ڈرانے کیلئے کہتیں۔ سو جاؤ۔ ۵۰۰۰ آگیا ہے۔ بچے سہم کر چپ ہو جاتے۔ اور پھر نہ بولتے۔

(۷)

دونوں شہر سے باہر نکل گئے۔ اور پھر بھی چلتے گئے دو کوس کے فاصلے پر ایک گھوڑی

گھوڑی تھی۔ سیاہ پوش اُسکے اوپر چڑھ بیٹھا۔ اور تلوتما کو اشارے سے کہنے لگا۔ تُم بھی آجاؤ۔"
تلوتما نے سوچا یہ تو بُری بات ہے غیر آدمی کے ساتھ جسم لگ جانا درست نہیں ہے
سیاہ پوش نے پھر اشارہ کیا۔ تلوتما پھر خاموش رہی۔
آخر تلوتما نے کہا "میں آپ کی مشکور رہوں کہ آپ نے میری مدد کی ہے۔ لیکن دِل آپ کے ساتھ گھوڑے پر چڑھنے کی اجازت نہیں دیتا۔"
سیاہ پوش نے نقاب پرے پھینکدی اور اس میں سے مردانہ بھیس کئے ہوئے سرسوتی کا چہرہ دکھائی دیا۔
تلوتما مُسکرائی۔ اور گھوڑی پر چڑھ گئی۔ سرسوتی نے نوٹوں کا بنڈل اُسے دیدیا۔ ایک ماہ تک دونوں اکٹھی ایک گمنام گاؤں میں رہیں۔ اور بعد میں سرسوتی کے شوہر کی رائے سے ایک خوبصورت نوجوان سے تلوتما کی شادی کر دی گئی۔
شادی کے بعد سرسوتی اور سرسوتی کا پتی تلوتما اور اونکار (تلوتما کا پتی)، گنگا کی سیر کو گئے وہاں تلوتما نے نوٹوں کا بنڈل دریا میں بہادیا۔
اُونکار نے پُوچھا "یہ کیا تھا؟"
تلوتما نے جوابدیا "۵۰۰۰ ہزار کے نوٹ"
اونکار نے حیرت سے پُوچھا "یہ پانی میں کیوں بہائے؟"
"تلوتما نے جوابدیا۔ یہ وہی ۵۰۰۰ ہے۔ جو مجھے بھوشنکر کا تما تھا۔ اور سانپ بنکر ڈستا تھا۔"

شیطان کا ہتھیار

اُن کا نام گوبند لال تھا؛ اور وہ بہت نیک منش آدمی تھے۔ اُن کے نزدیک ہونے سے دل کو راحت اور قلب کو مسرت نصیب ہوتی تھی۔ وہ اچھوں کے دوست اور بُروں کے خیر خواہ تھے۔ مگر اُن کے پاس وہ شے نہ تھی جو دُنیا میں سوائے دھوپ اور قوس قزح کے سب کو خرید سکتی ہے۔ اور جس کے حصول کے لئے نصف دُنیا روتی ہوئی اور نصف ہنستی ہوئی دن رات سرگرمی کے ساتھ کشمکش میں مشغول و مصروف رہتی ہے!

وہ بہت غریب تھے۔ اور قلم کے سر پر اپنی مفلسانہ زندگی کے دن گذار رہے تھے وہ اخبارات میں مضمون لکھتے تھے! کتب فروشوں کے لئے چھوٹی چھوٹی کتابیں تصنیف کرتے تھے۔ پروف پڑھتے تھے۔ اور اسطرح کی محنت سے جو کچھ اُنھیں میسر ہوجاتا تھا۔ اُس کا نصف حاجتمندوں میں تقسیم کر کے نصف میں اپنا گذارہ کر لیتے تھے۔

نیکی اُن کے سر پر محبت کے پھول برسا رہی تھی۔ مگر شاہراہ دولت اُن سے کوسوں دُور تھی۔ کہ ایک دن

۲

اُن کی قسمت کے آسمان پر مکمل بدبختی کی گھٹائیں چھا گئیں؛ اور اُنکی بیوی نے سخت علالت کی وجہ سے مایوس ہو کر کہا "پران ناتھ اب میرا جینا ناممکن ہے"

گوبند لال کو اُس سے بہت پیار تھا۔ یہ سُنکر وہ پاگل سے ہوگئے! اور اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر بولے "ابھی تمہارے مرنے کے دن نہیں ہیں تم نے دُنیا میں دیکھا ہی کیا ہے؟"

بیوی نے آہستہ آہستہ کہا "موت کا فرشتہ اندھا اور بہرا ہے۔ اگر اس کی آنکھیں اور کان ہوتے۔ تو دنیا میں بہت سی تباہی کے دردناک منظر دکھائی نہ دیتے۔"

گوبند لال رو کر بولے "پرمیوتی!"

پرمیوتی نے کہا "دیکھو موت کے سرد ہاتھ میری پیشانی کو چھو رہے ہیں۔ اور دنیا کی اشیاء مجھے الوداع کہتی ہوئی معلوم پڑتی ہیں۔ تمہارے پاس کچھ ہو۔ تو میں دان کرنا چاہتی ہوں۔"

گوبند لال کی جیب خالی تھی۔ کہنے لگے۔ "کتب فروش نے آج بیس روپے دینے کا اقرار کیا ہوا ہے۔ کلکتے کے اخبارات میں سے بھی دو نے آج روپیہ روانہ کرنا ہے۔ شام تک ہم بہت امیر ہو جائینگے۔"

"اور اسوقت؟"

"اسوقت میں کتب فروش کے ہاں جاتا ہوں۔ بیس روپے لے آؤں گا۔"

"مل جائینگے؟"

"ضرور ملینگے۔ کیا میں نے محنت نہیں کی۔ کیا میری کتاب سے اسے کافی روپیہ کمانے کی امید نہیں ہے۔ کیا وہ عمدہ لکھی ہوئی نہیں؟"

پرمیوتی بہت سمجھدار اور تجربہ کار عورت تھی۔ ہنس کر بولی "دنیا ہر ایک محنت کا معاوضہ نہیں دیتی۔ اور نہ ہی ہر ایک بات کو آسانی سے قبول کرتی ہے۔"

"بہت باتیں نہ کرو۔ ڈاکٹر نے منع کیا ہے۔"

"اچھا۔"

اور وہ چپ ہو گئی۔

گوبند لال حسرت آمیز نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے باہر نکلے اور شام نرائن پبلشر کی دکان پر پہنچے۔ ہچکچاتے ہوئے اندر قدم رکھا۔ اور چپ چاپ کرسی پر بیٹھ کر شام

نرائن کے منہ کی طرف دیکھنے لگے۔
شام نرائن نے کہا۔ "آپ آ گئے!"
"جی ہاں میری عورت سخت بیمار ہے۔ اور اس کے بچنے کی بہت کم اُمید ہے!"
"تو!"
"آپ مہربانی کریں۔ تو مرتے دم اُس کی حسرت نکل جائے۔ اور وہ اپنی اُن کی خواہش پوری کر لے۔ یہ اُس کی آخری آرزو ہے!"
"مجھے افسوس ہے۔ کہ میں آپ کی خواہش پوری نہیں کر سکتا!"
"کیوں؟"
"کیونکہ میرے آدمی نے مجھے۔ آپ کے متعلق عمدہ رائے نہیں دی۔ وہ کہتا ہے۔ کہ ایسی کتاب کا منڈی میں نکلنا بہت مشکل ہے!"
گوبند لال کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا۔ اور اُنہوں نے آپ کو گرنے سے بچانے کے لئے کرسی کو زور سے پکڑ لیا۔
اسی وقت اُس کی کتاب کا مسودہ اُن کے ہاتھ میں دیدیا گیا۔
یہی مسودہ تھا جس کی بنیاد پر اُن کے خیالی محل تعمیر ہو رہے تھے۔ اب گوبند لال کی نگاہوں میں در و دیوار گھومتے ہوئے۔ اور تمام دُنیا کے انسان یاس و حسرت سے ہاتھ ملتے ہوئے نظر آنے لگے۔ مکان و عمارتیں ناچتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ اُنہوں نے دیکھا کہ ڈاک خانہ کی وسیع عمارت سے وہ وجود چٹھی رساں برآمد ہوئے جو کاغذوں کی شکل میں لوگوں پر رنج، خوشی، ہمدردی، موت اور زندگی کی کرنیں پھینکنے کے لئے مشہور ہیں۔ گوبند لال بیتاب ہو کر دیکھنے لگے۔ کہ اُن کی قسمت کا ستارہ کس طرف جھلکتا ہے۔ اور جلدی سے اپنے کے چٹھی رساں کے نزدیک جا کر پوچھے
"کوئی میرا منی آرڈر ہے؟"

"نہیں"

"غور سے دیکھو"

چٹھی رسان نے فارموں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ اور پھر سر ہلا کر آگے چل دیا۔ گوبندلال کے سر پر غم کا پہاڑ پڑا۔ اور چاروں طرف تاریکی چھا گئی۔

خیال آیا۔ یار دوستوں سے امداد طلب کرنا چاہیئے۔ یہی تو اُن کی آزمائش کا وقت ہے۔ ایک ایک کرکے وُہ ایک ایک دروازے پر گئے۔ مگر کہیں سے بھی مطلب براری نہ ہوئی خشک ہمدردی کے الفاظ تھے۔ لفظی افسوس کے آنسو تھے۔ مگر ٹھوس امداد کہیں تھا نہ ملی۔ گوبندلال بالکل مایوس ہو گئے۔ اور اُن کے قدم گھر کی طرف مڑے۔

(۳)

"آ گئے؟"

"ہاں!"

"کچھ لا؟"

"نہیں"

پربھوتی خاموش ہو گئی۔ اور تب آہستہ سے اُس نے اشارہ سے گوبندلال کو نزدیک بلایا۔ اور دونوں ہاتھ گلے میں ڈال کر بولی "میں نے آپ کو بہت دُکھ دیا ہے"

گوبندلال روتے ہوئے بولے "پربھوتی میں نے تمہیں کوئی سکھ نہیں دیا۔ پرماتما کے دربار میں میں پاپی ٹھہروں گا"

"چھی چھی ایسا نہ کہو۔ آپ نے میرے لئے سب کچھ کیا ہے۔ لیکن جب قسمت میں ہی کچھ نہ ہو۔ تو سونا بھی مٹی میں تبدیل ہو جاتا ہے"

"لیکن کیا قسمت ہمارے لئے ہی بُری رہ گئی ہے"

پربھوتی مُسکرا کر بولی "نہیں یہ ہمارے کرموں کا پھل ہے"

اب پربیوتی کی حالت آگے سے بہتر تھی!

گوبندلال بولے "پربیے اب تم کو اب تو آرام معلوم دیتا ہے"

"نہیں"

"کیوں؟"

"چراغ بجھنے سے پہلے زور سے بلند ہوا کرتا ہے۔ چراغ کی لو گل ہونے سے پیشتر بھڑکا کرتی ہے۔ اب چونکہ موت قریب ہے۔ اسلئے مرض مریض کو چھوڑ گیا ہے۔ میرے بچنے کی کوئی آشا نہیں"

کیسا دردناک منظر تھا۔ موت کا فرشتہ بیوی کے پیچھے لپک رہا تھا۔ اور خاوند کے پاس دوائی کے لئے چار پیسے بھی نہ تھے۔

خاوند بیوی یکجا بیٹھے رہے۔ آخر بیوی کی حالت غیر ہونے لگی۔ اور جب نصف شب گذر چکی۔ تو پربیوتی نے خاوند کے پاؤں کے نیچے سے خاک چٹکی اٹھا کر سر میں ڈال لی۔ گوبندلال چپ چاپ رونے لگے، پربیوتی ٹکٹکی لگا کر اُن کی طرف دیکھنے لگی۔ اور تھوڑی دیر میں ہی چپ چپاتے دُنیا سے چل بسی۔

گوبندلال نے زور سے چیخ ماری۔ اور بیہوش ہو گئے۔

جب ہوش آئی۔ تو مکان اڑوسیوں پڑوسیوں سے بھرپور تھا۔ اور ہر ایک کی زبان پر ہمدردی کے الفاظ تھے۔ یہ دیکھ کر گوبندلال کو بہت غصہ آیا۔

اُنہوں نے لاش کو دیکھ کر کہا کل آگ کے شعلے اس کے حقدار ہونگے۔ مگر آج کی رات میری ہے۔ اس لئے میں یہ رات ضائع نہ کروں گا۔ سب اس مکان سے چلے جاؤ۔ اور مجھے اس کے پاس تنہا چھوڑ جاؤ"

ایک دو آدمیوں نے گوبندلال کو سمجھانا چاہا۔ مگر اُنہوں نے کسی کی نہ مانی۔ اور سُنا ان سُنا ایک کر دیا۔ آخر مکان خالی ہو گیا۔ اور رات کے سناٹے میں گوبندلال اپنی بیوی کی لاش کے پاس اکیلا رہ گیا۔

ایک چراغ جل رہا تھا اور اس کی روشنی پر بیوتی کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

گوبندلال پربیوتی سے لپٹ گئے اور پاگلوں کی مانند اس سے باتیں کرنے لگے کبھی رو کر کبھی ہنسکر، کبھی ہاتھ جوڑ کر، کبھی غصّے سے اُسے بلاتے اور دو دو باتیں کرنے کی درخواست کرتے۔ مگر سب بے فائدہ تھا۔ رات گذر گئی۔ دن چڑھا۔ دس گیارہ بجے کا وقت ہو گیا۔ گوبندلال کمرے سے باہر نہیں نکلے۔ اتنے میں سے کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

(۴)

گوبندلال باہر نکلے۔ دیکھا چٹھی رساں کھڑا ہے۔ اور کہہ رہا ہے "بابو جی آپ کا سَو روپے کا منی آرڈر ہے"

گوبندلال کو منی آرڈر کی آمد کا ذکر سن کر افسوس ہوا۔ انہی روپوں میں سے پندرہ بیس کل آجاتے تو دل کی حسرت نکل جاتی۔ اور شاید بیوی بچ جاتی۔ مگر اب تو یہ اور مٹی کے ٹھیلے دونو برابر تھے۔ گوبندلال کی نگاہوں میں فرق نہ تھا۔

گوبندلال نے دستخط کر کے روپے لئے۔ اور مُردہ بیوی کے قدموں میں رکھ دیئے چٹھی رساں دیکھ کر سنّاٹے میں آگیا۔ اور تین چٹھیاں جو گوبندلال کے نام تھیں۔ اُن کے ہاتھ میں دے کر جلدی سے کھسک گیا۔

گوبندلال نے بڑی بے پروائی سے چٹھیاں کھولیں۔ پہلی اُسی پبلشر کی طرف سے تھی۔ اس نے روپیہ بھیجا تھا۔

"تمہاری نظموں کی کتاب مجھے بہت پسند ہے۔ میں سر دست اُس کے لئے دو سو روپیہ دے سکتا ہوں۔ امید ہے آپ قبول فرمائینگے۔ سو روپیہ روانہ کرتا ہوں سو دو چار دن تک بھیجدونگا"

گوبندلال نے حقارت سے چٹھی پھینک دی۔ اور کہنے لگے "کل پچاس نہیں پچیس ہی بھیج دیتے۔ تو مجھے دا موں خرید لیتے۔ مگر آج اسکی ضرورت نہ تھی۔ وقت پر پانی کا چھینٹا بھی پڑ جائے تو کسان کا دل کھل جاتا ہے۔ مگر بے وقت موسلادھار بارش بھی بُری لگتی ہے"

دوسری چٹھی کھولی۔ گوبندلال کا رنگ بدلگیا۔ انہوں نے یقین کرنے کیلئے بار بار پڑھی۔ مگر چٹھی وہی تھی۔

"تمہارے رشتہ دار لالہ رام کشن کا انتقال شب گزشتہ کو ہوگیا ہے۔ وہ مرتے وقت ساری جائداد تمہارے نام لکھ گئے ہیں۔ فوراً یہاں پہنچو۔ اور انتظامات مکمل کرو۔"

چٹھی رام کشن کے کارندے کیطرف سے تھی۔ اسی رام کشن کو رو رو کر گوبندلال نے مدد کے لئے لکھا تھا۔ تو رام کشن نے اسی کارندے کے ہاتھوں سے جواب بھجوایا تھا کہ میرے پاس تمہارے لئے کچھ نہیں ہے۔ آج وہی کارندہ اسی گوبندلال کو لکھ رہا ہے کہ رام کشن ساری جائداد تمہارے نام کر گیا ہے۔

رام کشن بہت امیر آدمی تھا۔ تین چار لاکھ تو اس کا بینک میں ہی جمع تھا۔ کاروبار بہت عمدگی سے چل رہا تھا۔ اور رام کشن روپوں میں کھیلتا رہتا تھا۔

گوبندلال کی حالت بدل گئی۔ اب انہوں نے سوچا۔ کہ میں وہ گوبندلال نہیں ہوں جو ایک گھنٹہ پہلے تھا۔ اب میں لکھ پتی ہوں۔ اور روپیہ میری آنکھوں کے اشارے پر ناچ رہا ہے۔ پریتی مر گئی ہے۔ دل میں خیال تھا۔ دنیا چھوڑ کر سنیاسی ہو جائینگے۔ اب خواہش پیدا ہوئی۔ کہ چار دن امیری کے مزے بھی لوٹ ہی لیں۔ افلاس میں دنیا نہیں چھوڑی۔ اب لچھمی نے نگاہ مہر کی ہے تو اسے کیوں چھوڑ دیں۔ تاریک رات میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر روشنی کی تلاش کرتے تھے۔ اب چاند نے پالکہ میں آنکھیں کیوں بند کریں۔"

دولت کے آنے جانے کی خبر بہت جلد مشہور ہو جاتی ہے۔ روزانہ اخباروں میں سیٹھ رام کشن کی موت کا تذکرہ تھا۔ اور یہ بھی لکھا تھا۔ کہ وہ ساری جائداد مرتے وقت اپنے دور کے رشتہ دار گوبندلال کے نام لکھ گئے ہیں۔ یہ خبر پڑھ کر بہت سے آدمی گوبندلال کے پاس آگئے تھے۔

گوبندلال اب بھی پہلے گوبندلال نہ تھے۔ ہر چند کہ پریتی کی موت کا غم تھا۔ مگر پھر بھی دولت ملنے کی خوشی میں ہنسی ہونٹوں میں نکل ہی رہی تھی۔

زبانیں کانا پھوسیاں اور نگاہیں سرگوشیاں کرنے لگیں۔ ایک دو آدمی گوبند لال کے پاس سرک کر آئے۔ آہستہ آہستہ کچھ بات چیت ہوئی۔ پھر شرائط طے ہوئیں اور پرمیوتی کے لاش کے جلنے سے پہلے پہلے ہی گوبند لال کی منگنی ہوگئی۔ یہ سب دولت کے کرشمے تھے۔

(۵)

غریب آدمی کو روپے کی خواہش ہوتی ہے۔ امیر کو اُسے بڑھانیکا خیال ہوتا ہے گوبند لال دن رات اسی خیال میں مست رہنے لگے۔ کلکتہ کے ممتاز تاجروں میں اُن کا شمار تھا۔ مگر پھر بھی طبیعت شانت نہ تھی۔ شب و روز حرص کی آگ میں جلتے تھے۔

لاجونتی اُن کی عورت تھی۔ بہت نیک، بہت حسین گوبند لال سے اُسے پیار تھا۔ وہ اکثر کہا کرتی۔ کہ میں تمہارے ساتھ ہی ہوں۔ جب تک تم ہو تب تک میں ہوں۔ جب تمکو کچھ ہوا۔ تو میں بھی دُنیا میں نہ رہوں گی۔ گوبند لال یہ سُنکر ہنسا کرتے تھے۔

شادی کے ایک سال کے اندر اندر ہی لاجونتی کے والد انتقال کر گئے۔ اور ایک معصوم ننھا چار سالہ یتیم بچہ بلکنے کے لئے چھوڑ گئے۔ لاجونتی کی والدہ پہلے مرچکی تھی۔ اب بچہ بہن اور بہنوئی کے سپرد تھا۔

اُس معصوم بچے کے نام ساٹھ ستر ہزار روپیہ تھا۔ گوبند لال اُسکے سرپرست تھے چاندی کو دیکھ آنکھیں چندھیا گئیں۔ اور طبیعت میں انتشار کا آغاز ہوا۔

سازشیں کی گئیں، چالیں کھیلیں گئیں۔ لالچ دئے گئے معصوم بچہ بیمار تھا۔ دوائی کے کے پردے میں زہر پلا یا گیا۔ لاجونتی نے یہ دیکھا۔ اور ظالم خاوند کو راہ بد سے ہٹانا چاہا۔ مگر گوبند لال کسی کی نہ سُنتے تھے۔

معصوم لڑکا مر گیا۔ اُس کی بہین غم کے مارے کُڑھ کُڑھ کر تپ دق کا شکار ہو گئی مگر گوبند لال کی آنکھیں نہ کُھلیں۔

منشی بالمکند اُن کے احباب میں سے تھے۔ صاف دل اور آزاد گو۔ ایک دفعہ اُنہوں نے

گوبندلال کو سمجھانا چاہا۔ اس سے گوبندلال بہت بگڑے۔ یہ معمولی حیثیت کا آدمی ہو کر میرے سامنے گردن اُٹھاتا ہے۔ اور مجھے اپدیش دیتا ہے۔ یہ بڑی بیہودہ بات ہے۔ مانا میں ذرا راہ راست سے اِدھر اُدھر ہو جاتا ہوں مگر کیا لچھمی دیوی میں اتنی بھی سکت نہیں۔ کہ معمولی سی فروگذاشتوں پر پردہ ڈال سکے۔ دُنیا میں شریف آدمی اسلئے شریف نہیں ہیں۔ کہ وہ شریف ہونا پسند کرتے ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ وہ شریف ہونے کو مجبور ہیں۔ دولت پاکر بھی دو دن عیش نہ کئے۔ تو زندگی پر لعنت ہے"

منشی بالمکند نے ایک دفعہ پھر گوبندلال کے سامنے نشیب و فراز رکھے۔ گوبندلال نے منہ پھیر لیا۔ اور نوکر کو گاڑی تیار کروانے کا حکم دیا۔ بالمکند بولتے رہے۔ گوبندلال سنتے رہے بگھی تیار ہوئی۔ تو اُس میں جا بیٹھے اور نوکر کو ہنٹر لگانے کا اشارہ کیا۔ بالمکند یہ دیکھکر بہت نادم ہوئے۔ مگر عقلمند آدمی تھے۔ خاموش رہے۔

اسدن سے درپردہ گوبندلال بالمکند کے خلاف ہو گئے۔ کمیٹی کا انتخاب نزدیک آیا گوبندلال اور بالمکند کی ظاہرا طور پر چھڑ گئی۔ گوبندلال امیر آدمی تھے۔ انہوں نے تھیلی کا مُنہ کھولدیا۔ ضیافتیں ہونے لگیں۔ دن رات مہمانوں کا تانتا لگا رہتا۔ معمولی سے معمولی آدمی کے ساتھ بھی گوبندلال ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگے۔ مگر اس اخلاص کے نیچے غرض کا رنگ جھلکتا تھا۔

پرچیاں نوٹوں کے تول فروخت ہونے لگیں۔ اور کئی برجستوں کے مفلسانہ ایام ذرا آرام سے کٹنے لگے۔ گوبندلال سرتاپا ممبری کی دوڑ میں منہمک ہو رہے۔ انہوں نے روپے کو پانی کی مانند بہانا شروع کر دیا۔ مگر بالمکند کی طرف ایسی کوئی بات نہ ہوتی تھی۔ وہ اپنے حق میں لکچر دیتے تھے۔ پرجوش تقریریں کرتے تھے۔ اور عوام کے سامنے سچے سچے حالات رکھتے تھے۔ آخر یہ جنگ کے دن گذر گئے اور انتخاب کا دن نزدیک آگیا۔

گوبندلال اور بالمکند دونوں بے چین تھے۔ محنتی طالب علم امتحان کے نتیجے کیلئے

جسطرح بیتاب رہتا ہے۔ وہی حالت ان ممبرجی کے طالبوں کی تھی۔
نتیجہ نکلا۔ تو گوبندلال کا رنگ فق ہو گیا بالمکند کے چہرے پر بشاشت ناچنے لگی۔ اور لوگوں نے خوشی سے پگڑیاں اُچھال دیں۔ سچی قومی خدمت دولت کو شکست دے گئی اور ناموری کی راہ میں گوبندلال منشی بالمکند سے پیچھے رہ گئے۔
چار پانچ دن کے بعد منشی بالمکند کے مکان کو آگ لگ گئی اور اُسکی ۱۲ سالہ کنواری لڑکی غائب ہو گئی گوبندلال نے چھپتی ہوئی نگاہوں اور مکاری بھرے الفاظ میں منشی بالمکند سے افسوس کا اظہار کیا۔

(۶)

دُنیا سوتی تھی۔ مگر آسمان والوں کی محفل آراستہ تھی۔ گوبندلال بیٹھک میں بیٹھے ہوئے اپنے گذرے ہوئے دنوں کو دنوں کو یاد کر رہے تھے۔ اور سوچ رہے تھے کہ کیا تھے اور کیا ہو گئے۔ پھر حافظے نے پریموتی کی تصویر سامنے کھڑی کر دی گوبندلال بولے:
"پریموتی!"
پریموتی کا چہرہ مسکرایا۔ "تم مجھے بلانے کے حقدار نہیں ہو۔"
"کیوں؟"
"کیونکہ تم نے وفا کے اقراروں پہ پانی پھیر دیا ہے۔ اور عورت کے مرتے پہ دوسری شادی کر لی ہے۔ میں تمہاری تھی۔ مگر تم میرے نہ تھے ہیں مری نہ تھی۔ زندہ تھی۔ تمہاری پریکشا لینے کو یہ سب سوانگ رچایا تھا۔"
گوبندلال روکر بولے "پریموتی اب نہ آؤ گی؟"
"بالکل نہیں۔"
اور وہ غائب ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی لاجونتی روتی ہوئی دکھائی دی۔ اور گوبندلال کے استفسار پر بولی "میرا ننھا بھائی نہیں ملتا۔ اُسے ڈھونڈھتی ہوں۔"
"کہاں گیا ہے؟"

"پتہ نہیں"
اتنے میں ہی ایک طرف سے ننھا لڑکا آکر لاجونتی سے چمٹ گیا۔ اور کہنے لگا۔
"بہن میں مر گیا ہوں"
لاجونتی نے بھائی کو چوم کر کہا "کیسے"؟
لڑکے نے گوبندلال کی طرف اشارہ کیا "یہ سب ان کی مہربانی ہے"
چاروں طرف سے شور مچ گیا۔ اور قاتل قاتل کی صداؤں سے آسمان میں گھورنے والے ستارے بھی سہم گئے گوبندلال گھبرا گئے۔ اور کہنے لگے "یہ جھوٹ ہے"
لاجونتی نے قہر آلودہ نگاہوں سے گوبندلال کی طرف دیکھ کر کہا "میری موت کا بھی تو تم ہی سبب ہو"
گوبندلال اور نہ سن سکے۔ اُنہوں نے بزور آنکھیں بند کر لیں۔ اور کہا "یہ سب الزام ہے"
آنکھیں کھلیں تو منشی بالمکند کی لڑکی بال کھولے ہوئے دکھائی دی۔ اس کے چہرے پہ مُردنی چھائی ہوئی تھی اور وہ غصے سے گوبندلال کو دیکھ کر ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ اتنے میں منشی بالمکند سپاہیوں کو ساتھ لئے ہوئے داخل ہوئے۔ اور بولے وہ بندۂ گناہ، بندۂ نفس یہی انسان ہے!
گوبندلال بھاگنے کی کوششوں میں ہوئے۔ مگر سپاہیوں نے موقعہ نہ دیا۔ امیر ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی گئیں۔ اور نازک پاؤں کو بیڑیوں نے جکڑ لیا۔
ایک سپاہی نے اُسے دھکا دیکر کہا "چلو کرموں کے پھل بھوگو"
گوبندلال گڑگڑا کر بولے "کیا میں کسی طرح سے معاف نہیں ہو سکتا"
"بالکل نہیں قدرت معافی کا نام نہیں جانتی۔ شیطان کے ہتھیار۔ اب اپنا کیا ہوا لو"
دوسرا سپاہی ذرا رحمدل تھا۔ وُہ بولا "شیطان کا ہتھیار یہ تو نہیں۔ بلکہ دولت ہے یہ سنبھل نہیں سکا۔ گر گیا یہی اس کا قصور ہے"

گوبندلال سپاہی کے پاؤں میں گر پڑے اور بولے "مجھے بچالو"
سپاہی نے زور سے ٹھوکر لگا کر اُن کا سر پرے پھینکدیا۔ اب اُنہیں معلوم ہوا۔ کہ جب غریب آدمی مجھ سے کوئی درخواست کرتے تھے۔ اور میں اُنہیں سخت کلامی کے ساتھ رد کردیتا تھا۔ تو اُنہیں کتنا رنج ہوتا ہوگا۔
سپاہی نے زور سے نیزہ لگایا۔ اور گوبندلال کی چیخ نکل گئی۔ دیکھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(۷)

یہ سب خواب تھا۔ پریوتی کی لاش سامنے پڑی تھی۔ اور اُس کے قدموں میں سو روپے کا نوٹ رکھا ہوا تھا۔ اُس کے پاس ہی سیٹھ رام کشن کی وفات اور وصیت کی چٹھی گری ہوئی تھی گوبندلال کا سارا جسم لرز رہا تھا۔ وہ جلدی سے اُٹھے اور نوٹ کو دیا سلائی دکھادی
اُسیوقت ایک آدمی مکان میں داخل ہوکر بولا۔
"یہ کیا ہے"
گوبندلال نے جواب دیا "شیطان کا ہتھیار ہے"
اور یہ کہکر وصیت کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے اور سنیاسی بننے کا عزم کرکے مکان سے باہر نکل گئے ۔

کیفرِ کردار

کرموں کے پھل ہر کسی کو چکھنے پڑتے ہیں۔ بابو محمد حسین بھی اس سے محفوظ نہ رہے۔ لیکن اور لوگ اپنی برائیوں کو چھپاتے ہیں۔ بابو محمد حسین بھلائیوں کو چھپاتا رہے تھے۔ انہیں سٹیشن ماسٹری کرتے بیس سال ہو گئے۔ لیکن پاس پیسہ نہ تھا۔ ہر چند کہ ترغیبیں قدم قدم پہ جال بچھاتی تھیں۔ لیکن محمد حسین کی طبیعت کبھی ڈانواڈول نہیں ہوئی وہ رشوت کے روپے کو ہاتھ لگانا گناہ سمجھتے تھے۔ حق حلال کی کمائی کھاتے تھے آرام کی نیند سوتے تھے۔ اور ایمانداری سے ملازمت کے فرائض ادا کرتے تھے۔ تنخواہ قلیل تھی۔ خرچ زیادہ تھا۔ اس لئے کچھ بچا نہ سکتے تھے۔ اسی طرح عمر عزیز کے پینتالیس سال گذر گئے اور ان کی بیٹی زبیدہ نے پندرھویں سال میں قدم رکھا۔ اب تک خاوند بیوی کو فکر نہ تھی۔ لیکن یکایک آنکھیں کھلیں۔ تو دونو گھبرا گئے۔ اور سوچنے لگے کہ کیا کریں آنے والے اخراجات کا بوجھ گردن توڑ رہا تھا۔ مگر پاس پیسہ نہ تھا۔ محمد حسین کے سامنے پاس کی تصویر کھینچ گئی۔ دل گناہ کی جانب جھکنے لگا۔ اول اول ضمیر نے ملامت کی۔ لیکن غرض سے فرض کو دبا دیا۔ اور چند دن کے بعد تو یہ حالت ہو گئی کہ محمد حسین کامل طور پیسہ کے غلام بن گئے۔ ایک دن وہ تھا۔ کہ محمد حسین سینکڑوں پہ لات مارتے تھے۔ ایک یہ دن تھا۔ کہ وہ پیسے پیسے کیلئے ایمان بیچنے سے پرہیز نہ کرتے تھے۔ تب لوگ انہیں فرشتہ سمجھتے تھے اب شیطان کہتے تھے۔

ایکدن شام کے وقت ایک مسافر اُن کے پاس آکرادب سے بولا "میرے ساتھ کچھ اسباب ہے۔ اور کچھ نقد روپیہ۔ گاڑی صبح کو جائیگی۔ یہاں رہنے میں کوئی خطرہ تو نہیں"

محمد حسین کے سینے میں کسی خیال نے گدگدی کی سنبھل کر بولے "کتنا روپیہ ہے؟"

"دو ہزار"

"خطرہ تو ہے۔ سارا اُجاڑ علاقہ ہے۔ اکثر وارداتیں ہوجاتی ہیں"

"پھر کیا کروں؟"

"اسباب ڈیپازٹ کرادو۔ اور آپ میرے کوارٹر کے پاس سو رہنا چارپائی دیدینگے"

مسافر نے شکریہ ادا کیا۔ اور اسباب ڈیپازٹ کرادیا۔

اس سے مسافر کو تو اطمینان ہوگیا۔ لیکن محمد حسین کے دل میں خیالات کا ہجوم برپا تھا۔ اُنہوں نے سوچ وچار کے بعد فیصلہ کیا۔ کہ یہ دو ہزار روپیہ جانے نہ دوں گا۔ جھنڈ وکانٹے والے کو بلاکر دیرتک اس سے سرگوشی ہوتی رہی۔ دوراندیشی اور حرص کے سوال و جواب ہوئے۔ غرض اور فرض کی بحث ہوئی لیکن نتیجہ کے وقت غرض کا پلڑا جھک گیا۔ گناہ کا فیصلہ ہوا۔

رات کا وقت تھا۔ آسمان پر تارے چمک رہے تھے لیکن بابو محمد حسین کے دل کو قرار نہ تھا۔ اجنبی مسافر کوارٹر کے باہر چارپائی پر پڑا سو رہا تھا۔ کہ اتنے میں دست قدرت متحرک ہؤا۔ اور محمد حسین کے لڑکے نذیر احمد کو گرمی محسوس ہوئی۔ اُس نے چادر اُٹھائی۔ اور کوارٹر سے باہر نکل آیا۔ لیکن وہاں جگہ نہ تھی چارپائی پر مسافر سو رہا تھا۔ نذیر احمد غصّے سے لال پیلا ہوکر بولا "تو کون ہے؟"

مسافر سو رہا تھا۔ اُٹھ بیٹھا۔ اور ملائمت سے بولا "میں مسافر ہوں۔ بابو صاحب نے مجھے یہاں پڑ رہنے کی اجازت دی ہے"

"بکتے ہو۔ چارپائی خالی کرو۔ یہاں میں سوؤں گا"

مسافر نسبتاً حلیم الطبع تھا۔ خاموش اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور پرے درخت کے نیچے جا سویا۔ نذیر احمد نے چارپائی پر لیٹ کر چادر اوڑھی اور خراٹے مارنے لگا۔ لیکن آہ اُسکو اس امر کی خبر نہ تھی۔ کہ قضا اُس پر کھیل رہی ہے۔ اور وہ اُس نیند سونے کو ہے جس سے کوئی آنکھ بیدار ہونے کی قدرت نہیں رکھتی۔

پندرہ بیس منٹ گزر گئے۔ درختوں میں حرکت ہوئی۔ اور چھنڈو ایک قاتل اوزار لئے ہوئے آہستہ آہستہ چارپائی کے نزدیک پہنچا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ ضمیر صدائے احتجاج بلند کر رہی تھی۔ لیکن روپے کا لالچ ہاتھوں کو قوت اور پاؤں کو استقلال دے رہا تھا۔ اُس نے احتیاطاً چاروں طرف دیکھا پھر اس امر کا یقین کیا۔ کہ سونیوالا سو رہا ہے۔ دل کو مضبوط کرکے چادر اُتاری۔ سونیوالے کا سینہ ننگا کیا پھر ہاتھ اُٹھایا۔ اور چھُری چلا دی۔ نیند اور موت کا وصال ہو گیا۔

انسان کچھ سوچتا ہے۔ لیکن خدا کچھ اور منظور ہوتا ہے۔ بابو محمد حسین نے جو گڑھا دوسرے کے لئے کھودا تھا۔ اُس میں وہ خود گرا۔ چھنڈو نے لاش دریا میں پھینک دی اور مطمئن ہو کر محمد حسین کو اطلاع دی۔ اُنہوں نے اطمینان کی سانس لی لیکن اطمینان ہمیشہ کے لئے وداع ہونے کو تھا۔

صبح ہوئی تو مسافر نے سامنے آکر سلام کیا۔ محمد حسین کا خون خشک ہو گیا۔ رات سے نذیر احمد کا پتہ نہ لگتا تھا۔ شک نے سر نکالا۔ گھبرا کر بولے رات کہاں سوئے تھے؟"

"اس درخت کے نیچے"

"کیوں؟ میں نے تمہیں چارپائی دی تھی"

"مگر آپ کے صاحبزادے نے آکر اٹھا دیا"
محمد حسین کا کلیجہ دھڑکنے لگا۔ شبہ نے یقین کی صورت اختیار کی لڑکھڑاتے ہوئے بولے "پھر......"
مسافر نے جواب دیا "اس چارپائی پر وہ خود سویا تھا"
محمد حسین چند منٹوں تک پاگلوں کی مانند ہوا میں دیکھتے رہے۔ اور بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑے"

خون کا دھبّہ چھپنا ناممکن ہے۔ محمد حسین اور جھنڈو دونوں گرفتار ہوئے اور عدالت میں اُن پر مقدمہ چلا جس میں محمد حسین نے اپنے جرم کا فوراً اقبال کر لیا۔ اُن کی بیوی نے زیورات فروخت کر کے ایک زبردست بیرسٹر کھڑا کیا تھا۔ لیکن نتیجہ کچھ نہ ہوا۔ دونوں کو حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا دی +

نرائن دت سہگل اینڈ سنز پبلشرز و تاجران کتب مالکان آریہ بک ڈپو لوہاری دروازہ لاہور

کی

شائع کردہ ملکی۔ قومی۔ علمی۔ ادبی و مذہبی کتب کی

مختصر فہرست

جو کہ مطالعہ کے قابل ہے

چند ملکی و قومی کتب

گاندھی چرتر با تصویر اردو	۹ ر
〃 〃 ہندی	۸ ر
چرتر مالوی اردو	۸ ر
〃 ہندی	۸ ر
بھگوان تلک اردو	۸ ر
〃 ہندی	۸ ر
مجموعہ تقاریر مسٹر سی آر داس یعنی ہندوستان کے جنوبی شاہیوں کے لئے	۱۲ ر
اروگیہ دگ درشن	۱۲ ر
مہاتما گاندھی کی بانسری	۵ ر
سدا بہار کے پھول	۱۲ ر

شعر و سخن کی کتب

ترانۂ قوم	عہ
ترانۂ وطن	۱۰ ر
گلدستۂ سخن	[illegible]
کلام مخمور جلد اول	عہ
〃 جلد دوئم	۱۲ ر
〃 جلد سوئم	عہ
جاتی گوتیہ ہندی	عہ

کتب مصنفہ مترجمہ مہاشہ نارائن

نارائن رام چرتر اردو	[illegible]
〃 کرشن چرتر 〃	[illegible]
〃 دیانند چرتر 〃	عہ
〃 کرشن اپدیش 〃	عہ

بال راج کتھا ہندی	۱۲ ر
گیتا رہسیہ مکمل	عہ
قاتل کون ہے	۴ ر
لاکھ روپیہ کی چوری	۱۲ ر

شاہی سلسلہ کے نہایت عجیب و غریب ناول

شاہی لکڑ ہارا اردو	عہ
〃 〃 ہندی	عہ
〃 ڈاکو اردو	عہ
〃 〃 ہندی	عہ
〃 جادوگرنی اردو	عہ
〃 〃 ہندی با تصویر	عہ
〃 پتی پرائن اردو	۱۰ ر
〃 〃 ہندی با تصویر	عہ
〃 بھکھاری اردو	عہ
〃 〃 ہندی	عہ
〃 بھیدی اردو	۳ ر
〃 〃 ہندی	۵
〃 جسوت اردو	۱۰ ر
〃 پٹ مار 〃	۱۲ ر

کچھ آریہ سماجک کتب

ستسکار ودھی اردو	عہ
آریہ گاتھن حصہ اول	عہ
〃 حصہ دوئم	عہ
〃 حصہ سوئم	۱۲ ر
سنگیت رتنا	۵ ر
سندھیا فلاسفی اردو	۱۲ ر

سندھیا فلاسفی ہندی	۴ ر
دستار پوردک سندھیا	۴ ر
سندھیا منظوم	۴ ر
[illegible] موجد کون تھے	۴ ر
[illegible]	۴ ر
سچا آریہ جیون سدھار	۴
پیدائش عالم	[illegible]

کتب ہندی

درویتی بیتہ بھاوان	۳ ر
نل دمینتی	۴ ر
ساوتری ست وان	۴ ر
رامائن مکمل	[illegible]
[illegible] کی گنجی	۶ ر
سپھل جیون	۸ ر
چار دوست	۶ ر
اگنی ہوتر ودھیا	۶ ر
مدھومتی	۴ ر
بدھوا	۳ ر
شاہی لکڑ ہارا	عہ
شاہی ڈاکو	عہ

بنگالی زبان کے بہترین معرکۃ الآرا تصانیف کے شاندار تراجم

ترچھی چتون	عہ ر
رسیلی حقیقت	۱۲ ر
انتقام ساگر	۱۲ ر

کیاں کنڈ ... / ہیرو گن ... / کالی ... / تو کاڈو ... / انوتاپ ... / چیلا ... / انار کس ... / راد ہار ... / مدھوستہ ... / سنیا ... / بدھوا ... / گرو گنگی ... / آتشی ... / جاسو ... / طلسمی ... / رکت ... / پڑھی ... / پڑھے ... / واد ... / پیشیا ... / عورت ...

علاوہ ازیں ہر قسم کی اردو۔ ہندی۔ انگریزی۔ ملکی۔ قومی۔ مذہبی۔ اخلاقی و درسی کتب ہم سے بارعایت
مکمل فہرست مفت طلب فرماویں

ملنے کا پتہ :- نرائن دت سہگل اینڈ سنز پبلشرز تاجران کتب لوہاری دروازہ